شاد عظیم آبادی ان شعرا میں ہیں جنھوں نے جدید اثرات کو بہت پہلے قبول کیا تھا، چنانچہ انھوں نے بہت سے قطعات بھی کہے، سروش ہستی ان کے قطعات کا مجموعہ ہے، اس میں مختلف واقعات اور جذبات و تاثرات پر اڑتالیس قطعات ہیں، شاد اپنے دور کے اساتذہ میں تھے، لیکن دراصل وہ غزل کے شاعر ہیں اور اس میں وہ اپنے دور کے تمام شعرا میں ممتاز ہیں، اور تغزل میں ان کا جو پایہ ہے وہ قطعات نگاری میں نہیں ہے، تاہم وہ استاد فن تھے اور جس صنف کی طرف بھی توجہ کرتے تھے، اس میں کسی سے پیچھے نہ رہتے تھے، اس لیے ان کے قطعات میں بھی ان کی قادر الکلامی نمایاں ہے اور وہ ادبی حیثیت سے زیادہ خیالات کے اعتبار سے اصحاب ذوق کے مطالعہ کے لائق ہیں، کتاب کے شروع میں مرتب اور پروفیسر ذکی الحق کے قلم سے قطعہ نگاری کی تاریخ اور شاد کی قطعہ نگاری پر تبصرہ ہے،

## شرح تحفۃ العراقین

میر محمد اسمٰعیل ابجدی، تقطیع بڑی، ضخامت ۸۰۸ صفحات، کاغذ عمدہ، خوبصورت ٹائپ میں چھپی ہے، مجلد، قیمت تحریر نہیں، پتہ: مدراس یونیورسٹی مدراس سے ملے گی۔

کرناٹک (مدراس) کے والاجاہی خاندان کا ملک الشعرا میر محمد اسمٰعیل ابجدی فارسی اور اردو دونوں زبانوں کا قادر الکلام شاعر تھا، دونوں میں اس کے دیوان موجود ہیں، فارسی زبان کا ادیب بھی تھا، چنانچہ اس نے خاقانی کی مشہور مثنوی، تحفۃ العراقین کی شرح لکھی تھی، مدراس یونیورسٹی اس کی کئی کتابیں شائع کر چکی ہے، اب اس نے تحفۃ العراقین کی شرح بڑے اہتمام سے شائع کی ہے، اور اس کے لائق مرتب مولوی محمد یوسف کوکن لکچرار اردو نے جو کئی سال دار المصنفین میں رہ چکے ہیں، متعدد نسخوں سے مقابلہ کرکے اس کی تصحیح کی ہے، اور کتاب کے شروع میں خاقانی کے مختصر حالات تحریر کئے ہیں، اور تحفۃ العراقین کا تعارف کرایا ہے، اس زمانہ میں جب کہ ہندوستان سے فارسی کیا اردو کا بھی خاتمہ ہو رہا ہے، اس قسم کی یادگاروں کو زندہ کرنا بڑی علمی خدمت ہے، یہ غنیمت ہے کہ مدراس یونیورسٹی تک ابھی لسانی تعصب کی وبا نہیں پہنچی ہے، اور وہ اردو اور فارسی دونوں زبانوں کی خدمت کرتی رہتی ہے۔

"م"

جلد ۸۰ ماہ محرم الحرام ۱۳۷۷ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۵۷ء عدد ۲

مضامین

# شذرات

سر آغا خان کی وفات سے مسلمانوں کی ایک بڑی شخصیت اُٹھ گئی، وہ ایک اسلامی فرقہ کے امام و مذہبی پیشوا اور لاکھوں انسانوں کا مرکزِ عقیدت تھے، اُن کی شخصیت بین الاقوامی تھی، یورپ کے تمام ملکوں میں اُن کا بڑا اعزاز تھا، اور وہاں کے بڑے بڑے لوگوں سے اُن کے دوستانہ تعلقات تھے، اس زمانہ کا کوئی بڑا سے بڑا اعزاز ایسا نہیں ہے جو اُن کو حاصل نہ رہا ہو، اُن کی پوری زندگی یورپ کے گہوارۂ عیش و نشاط میں گذری، مگر اس میں پڑ کر وہ اپنے فرائض سے کبھی غافل نہیں ہوئے،

وہ بڑے مدبر اور بیدار مغز تھے، سیاست پر گہری نظر رکھتے تھے، علم و فن سے بھی ذوق تھا، کئی زبانوں سے واقف تھے، قومی و ملی جذبہ بھی رکھتے تھے، اور مسلمانوں کے عمومی معاملات میں کبھی فرقہ کی تفریق نہیں کی، اپنے فرقہ کی فلاح و بہبود کے ساتھ عام مسلمانوں کے معاملات سے بھی دلچسپی اور عملی ہمدردی رکھتے تھے، چنانچہ مسلم یونیورسٹی کے قیام کی کوشش سے لیکر ہندوستان کی آزادی اور پاکستان کے قیام تک مسلمانوں کے بہت سے معاملات میں اُن کی امداد و رہنمائی کی جس سے اُن کو فائدہ پہنچا، اُن کے خود نوشت حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ دینی عقیدہ میں راسخ اور بعض مذہبی معمولات کے پابند تھے، اسلام کی تبلیغ بھی کرتے تھے، اور اُن کے ہاتھوں پر بہت سے غیر مسلم مشرف باسلام ہوئے، اللہ تعالیٰ اُن کے ان نیک اعمال کے صلہ میں اُن کی مغفرت فرمائے، مسلمانوں میں اتنی بڑی شخصیت مدتوں میں پیدا ہوگی،

دوسرا حادثہ مولانا آزاد سبحانی کی وفات کا ہے، نئی پود کو کیا معلوم کہ ایک زمانہ میں مولانا کتنی بڑی شخصیت رکھتے تھے، اگر اُن کے دل و دماغ میں توازن اور خیالات و عمل میں استقلال ہوتا تو ہندوستان کے چوٹی



کے علماء اور لیڈروں میں اُن کا شمار ہوتا، وہ بڑے ذہین اور وسیع النظر عالم، معقولات کے ماہر اور سحر بیان خطیب تھے، اُن کی تقریر خطابت اور منطق کا مرقع ہوتی تھی، ایک زمانہ میں مدرسہ الٰہیات کانپور کے روحِ رواں اور مسجد کانپور کے واقعہ کے ہیرو تھے، ہندوستان کی جنگ آزادی میں بھی اُن کا حصہ تھا، تحریک ترکِ موالات میں اور اس کے بعد بھی کچھ دنوں تک گاندھی جی کے رفیق کار اور کانگریس کے سرگرم رکن رہے، مگر اُن میں استقلال نہ تھا، کسی مسلک پر زیادہ دنوں تک قائم نہ رہتے تھے، اور عجیب عجیب تحریکیں اختراع کرتے تھے، ادھر کئی سال سے اسلامی کمیونزم اور حکومتِ ربانی کے مبلغ بن گئے تھے، اور اس پر ایک کتاب بھی لکھی تھی، مگر کسی تحریک کو عرصہ تک نہ چلا سکے، اور سب کا خاتمہ ناکامی پر ہوا، ادھر عرصہ سے سب جماعتوں سے الگ ہو گئے تھے، اور اُن کی زندگی کا آخری دور گمنامی میں بسر ہوا، مگر اس حال میں بھی جب کہ بڑی شکستہ حالت میں حکومتِ ربانی کی تبلیغ کرتے پھرتے تھے، جب کسی مسئلہ پر گفتگو کرتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کوئی بڑا مفکر اور فلسفی بول رہا ہے، اُن کی خاموش موت دنیاوی شہرت کی بے ثباتی کا سبق آموز واقعہ ہے، ایک زمانہ میں جس کی خطابت کی سارے ہندوستان میں دھوم تھی، اس کی موت کو اخبارات نے ایک معمولی واقعہ سے زیادہ اہمیت نہ دی، اور بہتوں کو اس کی خبر بھی نہ ہونے پائی، لیکن اصل شہرت و ناموری عالم آخرت کی ہے، اللہ تعالیٰ اس سے سرفراز فرمائے،

اردو کے مسائل پر غور کرنے کے لئے شروع جولائی میں انجمن ترقی اردو کی جانب سے علی گڑھ میں جو کانفرنس ہوئی تھی، وہ اجتماع کی حیثیت سے خاصی کامیاب رہی، مختلف صوبوں کے ہر فرقہ اور ہر طبقہ کے اردو کے نمائندے اور ادیب و اہل قلم جمع ہو گئے تھے، اس کانفرنس میں جن مسائل پر بحث ہوئی، اور جو تجویزیں پاس ہوئیں، اُن کی تفصیل اخبارات میں شائع ہو چکی ہے، اس قسم کی کوششوں کا اگرچہ ابھی تک کوئی خاص نتیجہ نہیں نکلا، نہ صدر جمہوریہ نے اردو کے محضر کا کوئی جواب دیا، اور نہ ہمارے صوبہ کی حکومت کے رویہ میں کوئی تبدیلی ہوئی، مگر ان کوششوں کو بالکل بے نتیجہ بھی نہیں کہا جا سکتا،

اس سے اردو کی آواز ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں پہنچ گئی، اس کے متعلق بہت سی غلط فہمیاں دور ہوگئیں، اس کی مخالفت میں کمی آگئی اور ہر فرقہ اور ہر طبقہ میں اس کے حامیوں کی ایک جماعت پیدا ہوگئی، حتیٰ کہ حکومت بھی کسی نہ کسی حد تک اس کا حق ماننے پر مجبور ہوگئی، اگرچہ ابھی اس کا کوئی عملی نتیجہ نہیں نکلا ہے، یہ فوائد بھی کم نہیں، اور اس سے آیندہ کے لئے اردو کا راستہ صاف ہوتا ہے،

---

اردو کا معاملہ ہندوستان کی دوسری زبانوں سے بالکل جدا ہے، اس کو ایسا فرقہ وارانہ رنگ دیدیا گیا ہے، جس سے اکثریت کا ہر طبقہ متاثر ہے، حتیٰ کہ کانگریس بھی اس سے مستثنیٰ نہیں، چنانچہ وہ بڑے بڑے معاملات میں تو حکومت کی پالیسی بناتی، اور اس کی نگرانی کرتی ہے، مگر اردو کے معاملہ میں بالکل خاموش ہے، کبھی کبھی پنڈت جواہر لال کی آواز البتہ اردو کی حمایت میں بلند ہوجاتی ہے، مگر اس کی حیثیت صدا بصحرا سے زیادہ نہیں ہے، یا کبھی کانگریس کے کسی اور رکن کو اردو کی حالت زار پر رحم آگیا تو زبانی ہمدردی کرکے اپنے فرض سے سبکدوش ہوگیا، مگر خود کانگریس اس بارہ میں خاموشی ہی میں مصلحت سمجھتی ہے،

---

ان حالات میں اردو کے لئے کوئی تیز قدم نہیں اٹھایا جاسکتا، ورنہ اس کے مخالفوں کو فتنہ انگیزی کا موقع مل جائے گا اور اتنے دنوں میں اردو کے لئے جو فضا ہموار ہوئی ہے وہ بھی ختم ہوجائیگی، اسی کے ساتھ اور بھی فرقہ وارانہ مسائل اٹھ کھڑے ہوں گے، اس لئے فی الحال آئینی جد وجہد کے علاوہ اور کوئی صحیح راستہ نہیں ہے، اور اس کا جاری رکھنا ضروری ہے، جمہوری حکومت کروڑوں انسانوں کی آواز کو زیادہ دنوں تک نظر انداز نہیں کرسکتی، اس کے علاوہ ایک نہ ایک دن اردو کے بارہ میں فرقہ وارانہ پروپگنڈا ختم ہوکر اس کی اصل لسانی حیثیت اور کلچرل اہمیت ظاہر ہوکر رہے گی، اور حکومت اس کا حق دینے پر مجبور ہوگی، بشرطیکہ صحیح اصول سے کام کیا گیا، جو لوگ اردو کے لئے تیز قدم اٹھانے کے حامی ہیں وہ بھی پرجوش تقریروں اور تحریروں کے علاوہ عملاً اور کچھ نہیں کرسکے جس سے کوئی مفید نتیجہ نکلا ہو البتہ اردو کی مخالفت بڑھ جاتی ہے اسلئے ایسا راستہ کیوں نہ اختیار کیا جائے جو محفوظ بھی ہو اور دیکھئے مفید بھی، ابھی کوشش کے بہت مدارج باقی ہیں ان کے بعد اگر ضرورت ہوئی تو انقلابی قدم بھی اٹھایا جائیگا،



# مقالات

## کیا متفقہ اسلامی احکام کو بھی اجتہاد سے بدلا جاسکتا ہے؟

از مولوی حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی رفیق دار المصنفین

(۴)

**اولیات عمرؓ**

خلفائے راشدین کے جن فیصلوں کو تبدیلی احکام کے ثبوت میں پیش کیا جاتا ہے ان میں سب سے زیادہ زور حضرت عمرؓ کے ان فیصلوں پر دیا جاتا ہے، جن کا ذکر مورخین اولیات عمرؓ[1] کے نام سے کرتے ہیں، مثلاً سواد عراق کی زمین کا بندوبست، قطع ید کی منسوخی، حد خمر میں اسی کوڑے کی تعیین، امہات الاولاد کی خرید و فروخت کی ممانعت، ایک مجلس میں دی ہوئی تین طلاقوں کو طلاق بائن قرار دینا، گھوڑوں کی زکوٰۃ کی وصولی، کتابیہ سے نکاح کی ممانعت، ہجوگوئی اور تشبیب کی ممانعت، بیس رکعت تراویح با جماعت کی تعیین وغیرہ، ان کے علاوہ بھی بعض اولیات عمر کو ڈاکٹر محمصانی اور ادارۂ ثقافت کے فضلاء نے بطور ثبوت پیش کیا ہے، آیندہ صفحات میں ان تمام اولیات عمر کی تفصیل پیش کی جاتی ہے، اس سے اہل علم خود فیصلہ کرلیں گے کہ حضرت فاروقؓ کے یہ فیصلے کتاب و سنت کے خلاف تھے یا ان کے تقاضے اور منشا کے مطابق تھے۔

---

[1] اولیات عمر کی تعداد پچاس سے متجاوز ہے، ان کو اولیات دو مفہوم کی وجہ سے کہا جاتا ہے، ایک تو یہ کہ یہ کام سب سے پہلے حضرت عمرؓ نے کیا، مثلاً جیل خانہ کی ایجاد، دوسرے یہ کہ اس حکم کو اس صورت میں حضرت عمرؓ نے نافذ کیا یا کتاب و سنت سے اس کے دو پہلو نکلتے تھے، ان میں سے ایک کو حضرت عمرؓ نے مؤکد کردیا۔

**سواد عراق کا بندوبست**

سواد عراق کی زمینوں کا جو بندوبست حضرت عمرؓ نے کیا تھا، اس کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ یہ بندوبست نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس طرز عمل کے بالکل خلاف ہے، جو آپ نے خیبر میں اختیار فرمایا تھا، اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر مصلحت متقاضی ہو تو ہر صاحب امر کو یہ اختیار ہے کہ وہ اپنے اجتہاد سے جس ثابت شدہ اسلامی حکم کو چاہے بدل دے،

حضرت عمرؓ کے اس فیصلہ اور اسوۂ نبوی میں ان ہی لوگوں کو تخالف اور تضاد نظر آتا ہے جو اس مسئلہ پر سرسری اور سطحی نگاہ ڈالتے ہیں، مگر جو اہل علم فے و غنیمت کے سلسلہ میں قرآن کی مفصل ہدایات اور اسوۂ نبوی کے ہر پہلو پر نظر رکھتے ہیں، وہ کبھی یہ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتے کہ سواد عراق کی زمینوں کے بندوبست میں حضرت عمرؓ نے اپنے ذاتی اجتہاد کو قرآن کی ہدایات یا اسوۂ نبوی پر ترجیح دی،

حضرت عمرؓ کے طرز عمل کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ فے و غنیمت[۱] کے اموال و جائداد کی تقسیم کے سلسلہ میں قرآن نے جو ہدایات دی ہیں اور ان کی روشنی میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو طرز عمل اختیار فرمایا ہے ان پر ایک نظر ڈال لی جائے، ہم اختصار کے ساتھ ان کو پیش کرتے ہیں،

**فے اور غنیمت کے اموال کی قسمیں**

فے اور غنیمت کے ذریعہ جو چیزیں اسلامی حکومت کے قبضہ میں آئیں وہ دو طرح کی تھیں، ایک منقولہ اموال مثلاً روپیہ پیسہ، سونا چاندی، سواری اور سامان وغیرہ دوسرے غیر منقولہ جائدادیں، جیسے زمین، مکان وغیرہ،

---

۱ عام طور پر فے اور غنیمت میں یہ فرق کیا جاتا ہے کہ فے وہ مال ہے جو بغیر جنگ کیے ہوئے صلح یا معاہدہ کے ذریعہ حاصل ہو، غنیمت وہ مال ہے جو جنگ کے ذریعہ حاصل ہو، مگر یہ فرق ایک اصطلاحی فرق ہے، ورنہ قرآن، حدیث و آثار صحابہ میں یہ دونوں الفاظ ایک دوسرے کے معنی میں استعمال ہوئے ہیں، اسلئے یہاں دونوں لفظ کے استعمال میں اصطلاحی فرق کو ملحوظ نہیں رکھا گیا، بعض علماء نے فے اور غنیمت میں یہ تفریق کی ہے کہ غنیمت منقولہ اموال کو کہتے ہیں اور فے غیر منقولہ کو، قرآن کے ظاہری الفاظ سے یہ تفریق صحیح معلوم ہوتی ہے، مگر ارشاد نبوی میں اسلامی حکومت کی ہر طرح کی آمدنی کو فے کہا گیا ہے، اسلئے بالکلیہ یہ تفریق بھی صحیح نہیں ہے، مگر اکثر اعتبار سے صحیح ہے۔



**منقولہ اموال میں اسوۂ نبوی**

منقولہ اموال میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا عام طرز عمل یہ ہوتا تھا کہ آپ سب سے پہلے اسلامی حکومت کا حق خمس[۱] ۱/۵ نکلوا لینے کے بعد بقیہ ۴/۵ کو ضرورت و خدمت کے تحت فوجیوں میں تقسیم فرما دیتے تھے، یہ طرز عمل ان منقولہ اموال میں ہوتا تھا جو جنگ کے ذریعہ حاصل ہوتے تھے لیکن جو غیر منقولہ اموال صلح و معاہدہ یا بطور ٹیکس آپ کے پاس آتے تھے، اس میں خمس نہیں نکالا جاتا تھا، بلکہ قرآن کی ہدایت کے مطابق وہ سب آپ عام مسلمانوں میں تقسیم فرما دیتے تھے، اس تقسیم میں بھی آپ ضرورت و خدمت کا لحاظ فرماتے تھے،

خمس جو اسلامی حکومت کی ملکیت میں ہوتا تھا، قرآن کی ہدایت کے مطابق آپ اس سے کچھ اپنے اور اپنے اہل و عیال کے کفاف کے لیے لے لیتے تھے، اور بقیہ ذوی القربیٰ، یتامیٰ مساکین اور مسافروں پر صرف فرماتے تھے، اس سلسلہ میں قرآن کی ہدایت کا ذکر آگے آئیگا،

**غیر منقولہ جائدادوں میں آپ کا طرز عمل**

منقولہ اموال میں تو آپ کا طرز عمل ہمیشہ یہی رہا، مگر غیر منقولہ جائدادوں میں قرآن کے دیے ہوئے اختیار کے مطابق آپ کا طرز عمل حالات و مصالح کے پیش نظر مختلف مواقع پر مختلف رہا، کبھی آپ نے کسی جائداد کو مستحقین میں تقسیم کر دیا، کبھی مفاد عامہ کی خاطر اسے حکومت کی ملک قرار دیا، کسی جائداد کے بعض حصہ کو تقسیم کیا اور بعض کو اپنے اور اپنے اہل و عیال کی کفالت کے لیے مخصوص فرما لیا، کسی جائداد کو مہمانوں، مسافروں اور وفود کے اخراجات کے لیے خاص فرما دیا، غرض ضرورت و مصلحت کے مطابق آپ اس میں تصرف فرماتے تھے،

---

۱ خمس کو اسلامی حکومت کا حق اسلئے کہا گیا ہے کہ وہ بھی مصالح عامہ ہی میں صرف ہوتا ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم جنگ کے بعد فرمایا کرتے تھے کہ هذه غنائمكم وانه ليس لي فيها الا نصيبي معكم الخمس والخمس مردود فيكم یہ غنائم تمہارے ہی لیے ہیں، اس میں میرا حصہ بجز خمس کے کچھ نہیں ہے اور خمس بھی تمہارے ہی اجتماعی مصالح پر صرف کر دیا جاتا ہے،

اس سلسلہ میں سب سے پہلی غیر منقول جائداد آپ کو انصارؓ نے دی تھی، جس کو آپ وقتاً فوقتاً ضرورت مند مسلمانوں کو زراعت وغیرہ کے لیے عنایت فرمایا کرتے تھے، اس کے بعد ایک اہل کتاب صحابی حضرت مخیریقؓ نے غزوۂ احد کے دن[1] آپ کو اپنے چھ ذاتی باغات ہبہ کر دیے تھے، جس کی آمدنی کو آپ نے عام مسلمانوں کے لیے وقف فرما دیا تھا، اس کے بعد یہود مدینہ کے مشہور قبیلہ بنو نضیر کی جائداد اسلامی حکومت کے قبضہ میں آئی، اسی موقع پر سورہ حشر کا نزول ہوا اور اس میں اس جائداد اور دوسری غیر منقولہ جائدادوں کے بارے میں ہدایات دی گئیں، خاص طور پر بنو نضیر کی جائداد کے بارے میں آپ کو اسلامی حکومت کے سربراہ کی حیثیت سے پورا اختیار دیا گیا کہ آپ اسے جس طرح چاہیں اور جہاں چاہیں صرف کریں، چنانچہ آپ نے اس کا ایک حصہ مہاجرین میں تقسیم فرما دیا،[2] اور ایک حصہ کو ازواج مطہرات، اہل بیت اور اپنی

[1] اسی غزوہ میں یہ زخمی ہوئے اور شہید ہوئے، زخمی ہونے کے بعد انھوں نے یہ باغات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالہ کر دیے تھے، ان کے بارے میں آپ نے فرمایا تھا مخیریق سابق یہود مخیریق یہود میں سب سے آگے جانے والوں میں ہیں،

[2] بعض روایتوں سے پتہ چلتا ہے کہ بنو نضیر کی . . . . . . . . . . کل زمین و باغ کی آمدنی کو آپ نے اپنے اہل و عیال کے کفاف کے لیے مخصوص کر لیا تھا، اور اس سے جو کچھ بچ جاتا تھا وہ آپ سامان جہاد کی تیاری میں صرف کرتے تھے، لیکن ان دونوں روایتوں میں کوئی تضاد نہیں ہے، چونکہ اس جائداد میں خدا نے آپ کو کلی اختیار دیا تھا کہ آپ جس طرح چاہیں صرف کریں، اس لیے اس اختیار کی بنا پر اس کو عام طور پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا خالصہ کہا جاتا تھا، اسی بات کو بعض رواۃ نے یوں بیان کیا ہے کہ یہ جائداد آپ کے لیے مخصوص تھی، مگر اس میں یہ ذکر نہیں ہے کہ آپ نے اسے تقسیم نہیں کیا، بلکہ اس میں محض آپ کے قبضہ و اختیار کا ذکر ہے، اس لیے کچھ حصہ کا تقسیم کر دینا اس کے منافی نہیں ہے، زرقانی نے اس کی ایک اور توجیہ کی ہے وہ یہ کہ آپ نے منقولہ اموال اور مکان مہاجرین میں تقسیم کیا، زمین اور باغ نہیں، اسی کو راویوں نے یوں بیان کیا کہ آپ نے ان کے اموال کو مہاجرین میں تقسیم کیا، یہ توجیہ اس لیے قرین قیاس ہے کہ آپ نے انصار سے

(باقی حاشیہ صفحہ ۸۹ پر)



کفالت کے لیے مخصوص فرما لیا، جو حصہ اپنے اہل و عیال کے لیے مخصوص فرمایا تھا، اس کی آمدنی سے صرف بقدر کفاف ازواج مطہرات اور اہل بیت کو عنایت فرماتے تھے، بقیہ آمدنی دینی ضروریات اور جہاد کے سامان کی تیاری میں صرف[1] ہوتی تھی، حضرت عمرؓ کے الفاظ ہیں

| اموال بنو نضیر جساً لنوائبه | بنو نضیر کی ساری جائداد آپ کی ان دینی و دنیاوی ضروریات کے لیے مخصوص تھی جو آپ کو پیش آتی رہتی تھیں، |
| --- | --- |

بنو نضیر کے بعد دوسرے یہودی قبیلہ بنو قریظہ کی جائداد آپ کے قبضہ میں آئی، خمس نکالنے کے بعد اس کو آپ نے تمام مسلمانوں میں تقسیم کر دیا، فتوح البلدان میں امام زہری کا قول منقول ہے کہ

| قسمها رسول الله صلی الله علیه وسلم بین المسلمین علی السهام[2] | ان کی جائداد کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں میں حصہ کے مطابق تقسیم کر دیا۔ |
| --- | --- |

**خیبر کی جائداد** اب تک مسلمانوں کو جتنی جائدادیں ملی تھیں ان میں سب سے بڑی جائداد خیبر میں ملی،[3] خیبر کے بارے میں عام طور پر مشہور ہے کہ خمس نکالنے کے بعد اس کو فوجیوں میں تقسیم کر دیا گیا،

(بقیہ حاشیہ ص ۸۸) پوچھا کہ بنو نضیر کے اموال کو تمھارے اور مہاجرین دونوں کے درمیان تقسیم کر دیا جائے یا صرف مہاجرین میں، انھوں نے بخوشی اسکی اجازت دیدی کہ مہاجرین میں تقسیم کر دیا جائے، صرف دو ضرورتمند انصاریوں کو اس میں سے حصہ دیا گیا تھا ان کا استدلال لفظ اموال پر ہے

[1] حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ فیجعل مجعل مال الله اس کو اسی طرح صرف کرتے تھے جس طرح خدا کے مال کو صرف کرنا چاہیے، اس سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ آپ کا یہ قبضہ قبضہ مالکانہ نہیں، بلکہ قبضۂ حاکمانہ تھا،

[2] ص ۲۹ نیز زرقانی ج ۲ ص ۱۶۵ [3] خدا نے حدیبیہ کے موقع پر یہ وعدہ کیا تھا کہ وعدکم الله مغانم کثیرة تاخذونها، اللہ کثیر مال غنیمت کا وعدہ کرتا ہے جو تمھارے ہاتھ آئیگا، اس وعدہ کے ایفا کی ابتدا خیبر ہی سے ہوئی،

مگر یہ بات کسی ایک روایت سے بھی ثابت نہیں ہے، بلکہ خیبر کے ..........

...... منقولہ اموال کی تقسیم تو اسی طرح کی گئی جس طرح اس سے پہلے آپ فرمایا کرتے تھے[1]، اور غیر منقولہ جائداد کی تقسیم یوں کی گئی کہ خمس نکالنے کے بعد پوری جائداد ۳۶ حصوں میں تقسیم کر دی گئی، جن میں سے اٹھارہ حصے دینی و سیاسی ضروریات کے لیے مخصوص کر لیے گئے، بقیہ اٹھارہ حصوں کو تمام فوجیوں میں تقسیم کر دیا گیا، ابو داؤد اور فتوح البلدان میں ہے کہ

| | |
|---|---|
| قسم خیبر علی ستۃ وثلثین سھماً | خیبر کو ۳۶ حصوں میں تقسیم کیا گیا، اٹھارہ |
| لرسول اللہ ثمانیۃ عشر سھماً | حصے ان ضروریات کے لیے مخصوص کر لیے گئے |
| لما ینوبہ من الحقوق وامر الناس | جو آپ کو اسلامی حکومت کے سربراہ کی حیثیت سے پیش |
| والوفود وللمسلمین ثمانیۃ عشر | آتی تھیں، مثلاً لوگوں کی نگہداشت، حادثات |
| سھماً اقتسموھا بینھم | اور وفود کے اخراجات وغیرہ، اور بقیہ اٹھارہ حصے مسلمانوں میں حصے کے مطابق تقسیم |

خیبر کے بعد فدک اور وادی القریٰ کی اراضی آپ کے قبضہ میں آئیں، فدک کے بارے میں بھی یہ مشہور ہے کہ یہ جائداد آپ کی ذاتی ملکیت تھی، مگر یہ صحیح نہیں ہے، چونکہ اس جائداد کے حاصل کرنے میں کوئی جنگ نہیں کرنی پڑی تھی، اس لیے آپنے اس میں سے کسی مخصوص مسلمان کو کوئی حصہ نہیں دیا، بلکہ اسلامی حکومت کے سربراہ کی حیثیت سے آپنے اس کو اپنے قبضہ و نگرانی میں رکھا، مگر اس کی ساری آمدنی مسافروں اور مہمانوں پر صرف فرماتے تھے،

---

[1] غزوۂ خیبر کے عین موقع پر مہاجرین حبشہ واپس آئے تھے، آپنے ان کا حصہ بھی اس میں لگایا تھا، بعض لوگوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ آپ نے ان کو غیر منقول جائداد میں سے حصہ دیا، یہ صحیح نہیں ہے۔

[2] اس سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ کسی جائداد کے آپ کے ہونے کا مطلب کیا ہے،



| | |
|---|---|
| وکان یصرف ما یاتیہ منھا | جو کچھ اس سے آمدنی ہوتی تھی اس کو آپ |
| الی ابناء السبیل[1] | مسافروں اور مہمانوں پر صرف فرماتے تھے، |

فدک و خیبر کے بعد مکہ فتح ہوا[2]، مکہ کے بعد طائف و حنین قبضہ میں آئے، مگر ان سب کے لیے مسلمانوں کو باقاعدہ جنگ کرنا پڑی، بلکہ حنین و طائف میں تو جان و مال کی بھاری قربانی بھی دینی پڑی، مگر ان تینوں جگہوں میں سے کسی جگہ کی زمین آپ نے فوجیوں میں تقسیم نہیں کی، مکہ میں صرف مہاجرین کو اس بات کی اجازت دی گئی کہ وہ اپنے ان مکانات پر قبضہ کر لیں، جو ہجرت کے وقت چھوڑ کر چلے گئے تھے اور جن پر کفار نے قبضہ کر لیا تھا، طائف کے بعد کوئی ایسا مقام نہیں تھا جس کو آپنے باقاعدہ فتح کر کے قبضہ فرمایا ہو،

منقولہ اور غیر منقولہ جائداد کی تقسیم کے بارے میں جو طرز عمل آپنے غزوۂ بدر سے لیکر غزوۂ طائف تک اختیار فرمایا تھا، اس کا ایک مختصر خاکہ آپ کے سامنے رکھ دیا گیا ہے، اس کی روشنی میں آپ حضرت عمرؓ کے اس طرز عمل کو دیکھیے جو انھوں نے سواد عراق کے سلسلہ میں اختیار فرمایا تھا، کیا حضرت عمرؓ نے سواد عراق میں بالکل وہی طرز عمل اختیار نہیں کیا جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مخریق کے باغات، بنو نضیر کی جائداد، خیبر کی نصف زمین، اور فدک و وادی القریٰ کی اراضی اور مکہ و طائف کے مملوکات میں اختیار فرمایا تھا، آپ نے بنو قریظہ کی زمین و باغات کے علاوہ کسی غیر منقولہ جائداد کو بھی مکمل طور پر تقسیم نہیں فرمایا، بلکہ بنو قریظہ کے بارے میں بھی بعض روایتوں میں آتا ہے کہ اسکو صرف آپ نے مہاجرین

---

[1] فتوح البلدان ص ۳۶ ابو داؤد میں حضرت عمرؓ کے الفاظ یہ ہیں وکانت فدک لابناء السبیل

[2] بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ مکہ عنوۃً فتح نہیں ہوا اس لیے اسکی جائداد تقسیم نہیں ہوئی، امام ابن تیمیہ اور امام ابن قیم نے بدلائل یہ بتایا ہے کہ یہ عنوۃً فتح ہوا، اسکے باوجود آپنے اس کو تقسیم نہیں کیا اسکی تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے،

ہی میں تقسیم کیا تھا، انصار میں صرف تین آدمیوں نے حصہ پایا تھا، غرض یہ کہ غیر منقولہ جائداد کی آپ نے جو بھی تقسیم فرمائی وہ اس بنا پر نہیں کہ وہ لازماً فوجیوں کا حق تھا، بلکہ ضرورت و مصلحت کے تحت آپ نے ان کی تقسیم فرمائی،

اوپر جو کچھ عرض کیا گیا ہے، اس کا تعلق تمام تر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس طرز عمل سے ہے جو آپ نے فے و غنیمت کی تقسیم کے سلسلہ میں اختیار فرمایا تھا، اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آپ نے غیر منقولہ جائدادوں میں مختلف طرز عمل کیوں اختیار فرمایا، تو اس کا جواب یہ ہے کہ آپ نے ایسا اپنے جی سے نہیں بلکہ قرآن کی ہدایت و اجازت سے کیا،

فے و غنیمت کے سلسلہ میں قرآن نے ابتدا ہی سے مسلمانوں کے ذہن میں یہ بات اتارنے کی کوشش کی کہ تمام غنیمت محض تمھاری کوششوں سے نہیں ملا ہے، بلکہ یہ خدا کا عطیہ و انعام ہے، چنانچہ پہلی بار غزوہ بدر میں غنیمت کی تقسیم کے سلسلہ میں مسلمانوں نے آپ سے سوال کیا تو ان کو جواب دیا گیا کہ یہ خدا اور اس کے رسول کا حق ہے،

یسئلونک عن الانفال قل — تم سے یہ مال غنیمت (انفال) کے بارے میں

الانفال للہ وللرسول — سوال کرتے ہیں، کہدو کہ خدا اور اس کے رسول کا ہے (انفال - ۱)

اس جواب کے بعد اس بارے میں ان کو کچھ اور تنبیہیں کی گئیں، اس کے بعد کچھ اور احکام دیے گئے پھر اس کا مصرف بتایا گیا،

وَاعْلَمُوْا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ — جان لو کہ جو مال غنیمت تم کو ملے اس میں سے

فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ — پانچواں حصہ اللہ اور اس کے رسول کا ہے

وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَ — اور اس میں ایک قرابتداروں اور یتیموں

الْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ — اور غریبوں اور مسافروں کا حق ہے،



اس آیت میں غنیمت کے کل حصہ کے ۱/۵ کا مصرف تو بتا دیا گیا مگر بقیہ ۴/۵ کے بارے میں کوئی واضح ہدایت نہیں دی گئی، اگر منقولہ و غیر منقولہ مال غنیمت کا ۴/۵ حصہ بہر صورت فوجیوں میں تقسیم کرنا ضروری ہوتا تو اس کی تصریح قرآن ضرور کر دیتا، اب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اسوہ سے جو اس کی تبیین و تفسیر کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ منقولہ چیزیں اگر وہ جنگ سے حاصل ہوئی ہیں تو لازماً فوجیوں میں تقسیم کر دی جائیں گی، اور اگر بغیر جنگ کے کوئی منقولہ مال ملا ہے تو اس کو عامۃ المسلمین میں تقسیم کر دیا جائے گا، یا اس سے ان کے مفاد کا کوئی کام کیا جائے گا، غزوہ بدر میں کوئی غیر منقولہ جائداد مسلمانوں کو نہیں ملی تھی، اور نہ ان کے سامنے اس کی تقسیم کا کوئی سوال پیدا ہوا تھا، بلکہ صرف منقولہ چیزیں ملی تھیں، اور ان ہی کو آپ نے ان کے درمیان تقسیم فرمایا تھا[1]، غیر منقولہ جائداد کے بارے میں اصل حکم غزوہ بدر کے دو سال بعد یعنی ۴ھ میں بنو نضیر کی جلاوطنی کے وقت نازل ہوا،

وَمَا اَفَاءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْهُمْ — جو کچھ اللہ نے اپنے رسول کو ان سے دلوا دیا،

فَمَا اَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَّلَا — اس کے لیے تم نے نہ تو گھوڑے دوڑائے

رِكَابٍ وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهٗ — اور نہ اونٹ لیکن اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کو

عَلٰى مَنْ يَّشَاءُ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ — جس پر چاہتا ہے غالب کر دیتا ہے، اللہ

(حشر) — ہر چیز پر قادر ہے۔

یہ حکم خاص طور پر ان اموال کے بارے میں ہے جو بغیر جنگ کے اسلامی حکومت کے ہاتھ میں آئیں خواہ وہ منقولہ ہوں یا غیر منقولہ، اس کے بارے میں اس آیت میں یہ بات بتا کر کہ یہ

---

[1] مگر چونکہ یہاں لفظ عام واقع ہوا ہے انما غنمتم من شئی جس سے منقولہ اور غیر منقولہ دونوں طرح کی چیزیں مراد ہو سکتی ہیں اس لیے بعض ائمہ نے آپ کے اس طرز عمل پر جو آپ نے منقولہ اموال کے بارے میں اختیار فرمایا تھا، غیر منقولہ چیزوں کو بھی قیاس کیا، مگر یہ قیاس ہے اور آگے قرآن کی صراحت آ رہی ہے۔

غلبہ واقتدار خدا کا وہ خاص فضل ہے جو اس کے رسولوں کے ساتھ مخصوص ہے، اس طرف اشارہ کردیا گیا کہ اس غلبہ کے نتیجہ میں جو کچھ حاصل ہوا ہے، اس کو کسی خاص فرد کی ملکیت میں نہیں دیا جاسکتا، بلکہ اس کا اصل مالک تو خدا ہے، اور خدا کی نیابت اس دنیا میں نبی کرتا ہے، اس لیے اس کا مصرف اپنی صوابدید سے وہی مقرر کرے گا۔[1] چنانچہ مذکورہ آیت کے بعد پھر متعدد آیتیں اس کی توضیح کے لیے نازل ہوئیں، جن میں واضح طور پر یہ بتایا گیا کہ آئندہ جو بھی جائداد ہاتھ آئے گی، وہ کسی مخصوص گروہ کا حصہ نہیں ہوگی، بلکہ اس میں موجودہ مسلمانوں کے ساتھ قیامت تک آنیوالے مسلمانوں کا حق بھی ہو، اور اس تقسیم کا حق چند قیود وکیسا تھ صرف امام وقت یا حکومت راشدہ کو ہوگا، وہ آیتیں یہ ہیں:

| | |
|---|---|
| ما افاء اللہ علی رسولہ من | جو کچھ اللہ تعالیٰ نے دوسری بستی والوں سے |
| اھل القری فللہ وللرسول | رسول کو دلوادیا ہو، اسمیں خدا کا حق ہو اور رسول |
| ولذی القربی والیتمٰی والمساکین | کا حق ہو، قرابتداروں اور یتیموں کا حق ہو اور |
| وابن السبیل۔[2] کیلا یکون | غریبوں کا اور مسافروں کا حق ہو تاکہ وہ |
| دولۃ بین الاغنیاء منکم | تمھارے چند دولتمندوں کے درمیان |
| وما اتاکم الرسول فخذوہ | گردش نہ کرنے لگے۔ جو کچھ رسول تم کو دیں |
| وما نھاکم عنہ فانتھوا و | وہ لے لو اور جس چیز سے تم کو روک دیں |
| اتقوا اللہ ان اللہ شدید | رک جاؤ اور اس بارے میں اللہ سے |
| العقاب[3] | ڈرو، اللہ تعالیٰ سخت سزا دینے والا ہے، |

[1] اس آیت کی تفسیر کے لیے احکام القرآن جصاص اور احکام القرآن قاضی ابوبکر بن عربی مالکی اور زاد المعاد دیکھنی چاہیے [2] یہاں تک تو ان ہی مصارف کا ذکر ہے جن کا ذکر سورہ انفال میں خمس کے سلسلہ میں کیا گیا تھا، مگر آگے اس کے مصارف کو بالکل عام کردیا گیا ہے۔ [3] ان آیات کی جو تشریح امام ابوبکر جصاص نے کی ہے وہ ملاحظہ ہو، سورہ انفال کی آیت واعلموا انما غنمتم (باقی ص ۹۵)



اس کے بعد پھر فقراء مہاجرین کا تذکرہ کیا گیا ہے، پھر انصار کا، پھر اس کے بعد آئندہ آنے والے مسلمانوں کے حق کے بارے میں وضاحت کی گئی، والذین جاء و من بعدھم اور انکے بعد جو مسلمان آئندہ آئیں گے، ان کا حق بھی اس میں ہے (حشر، رکوع ۲)

ان آیات میں تین جملے خاص طور پر قابل غور ہیں، ایک کیلا یکون دولۃ بین الاغنیاء منکم اور دوسرا ما اتاکم الرسول فخذوہ وما نھاکم عنہ فانتھوا، اور تیسرا والذین جاؤا من بعدھم، پہلے جملہ میں یہ تنبیہ کی گئی کہ ان اموال کی تقسیم اس طرح نہ کیجائے کہ یہ چند مخصوص آدمیوں کے ہاتھ میں چلے جائیں، اور ان ہی میں گردش کرتے رہیں اور دوسرے لوگ اس سے بالکل محروم رہ جائیں، پھر دوسرے جملہ میں یہ بات بتائی گئی کہ اس کی تقسیم نبی صلی اللہ علیہ وسلم جس طرح بھی کردیں، اس پر سب کو راضی ہو جانا چاہیے، کیونکہ اسلامی حکومت کے سربراہ اور بحیثیت نبی آپ کو یہ حق ہے کہ ضرورت و مصلحت کے تحت آپ جس طرح چاہیں اس کو تقسیم کریں، تیسرے جملہ میں پھر یہ بات واضح کردی گئی کہ یہ صرف چند موجودہ مسلمانوں کا حق نہیں ہو، بلکہ قیامت تک اسلامی مملکت میں جو مسلمان پیدا ہوتے رہیں گے، ان سب کا حق اس میں ہے،

ان ہی آیات کی روشنی میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر منقولہ جائداد کے بارے میں وہ مختلف طرز عمل اختیار فرمایا جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے،

(بقیہ حاشیہ ص ۹۴) کے بارے میں فرماتے ہیں فی الاموال سوی الارضین وفی الارضین اذا اختار الامام ذالک۔ پھر سورہ حشر کی ان آیات کے بارے میں فرماتے ہیں وما افاء اللہ علی رسولہ من الارضین فللہ وللرسول ان اختار ترکھا علی ملک اھلھا ویکون ذکر الرسول ھنا لتفویض الامر علیہ فی صرفہ الی من رای۔ یعنی سورہ انفال کا تعلق منقولہ اموال سے ہے اور سورہ حشر کا تعلق غیر منقولہ سے ہے۔

اب قرآن کی ان تصریحات اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مذکورہ بالا طرز عمل کو سامنے رکھکر حضرت عمرؓ کے تنہا نہیں بلکہ تمام قابل ذکر صحابہ کے فیصلہ پر ایک نظر ڈالیے۔

عراق کا وہ زرخیز علاقہ جو دجلہ و فرات کے درمیان واقع ہے جس کی سرسبزی و شادابی کی وجہ سے اسکو عرب سواد[1] کہا کرتے تھے۔ وہ ۱۶ھ میں فتح ہوا۔ گو اس سے پہلے شام وغیرہ کے علاقے فتح ہو چکے تھے، اور ان میں سے کسی علاقہ کو آپنے فوجیوں میں تقسیم نہیں کیا تھا، مگر جب یہ سب سے زیادہ زرخیز علاقہ فتح ہوا تو بعض صحابہ کی طرف سے اس کی تقسیم کا مطالبہ ہوا، مگر حضرت عمرؓ نے اس کی تقسیم سے انکار کیا، لیکن جب ان کا اصرار بہت بڑھا تو حضرت عمرؓ نے کہا کہ عام صحابہ سے مشورہ کر لیا جائے[2]، ان کی جیسی رائے ہوگی ویسے ہی عمل کیا جائیگا چنانچہ آپنے سب کو جمع کرکے یہ تقریر کی، حمد و ثنا کے بعد فرمایا:

میں نے آپ لوگوں کو اس لیے جمع کیا ہے کہ میں نے آپکے معاملات کی جو ذمہ داری اٹھائی ہے، اس میں آپ میری مدد کریں، اس لیے کہ میں بھی آپ ہی لوگوں جیسا ایک آدمی ہوں، آج آپ لوگوں کو ایک حق بات کا فیصلہ کرنا ہے، اس فیصلہ میں آپ یہ نہ دیکھئے کہ کس نے میری مخالفت کی ہے اور کس نے موافقت کی ہے، میں نہیں چاہتا کہ آپ میری خواہش اور رائے کی پیروی کریں، آپکے ہاتھ میں کتاب اللہ موجود ہے، جو خود حق بات کو واضح کردے گی، میں جو کچھ کہوں گا، اس کا مقصود اظہار حق ہوگا (اپنی رائے مسلط کرنا نہیں ہوگا)

اس تمہید کے بعد آپنے فرمایا کہ

---

[1] جو چیز گہرے سبز رنگ کی ہوتی ہے، اس کو عرب عموماً سواد و سیاہی ائل کہا کرتے ہیں [2] تمام صحابہ کے ناموں کا ذکر نہیں ہے، صرف حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت طلحہؓ وغیرہ کا ذکر ہے، مگر یہ مذکور ہے، من کبرائھم واشرافھم۔ ان میں جو ممتاز اور بڑے تھے، ان سب کو جمع کیا ہے



آپ لوگوں نے سنا ہوگا کہ جو لوگ سواد عراق کی تقسیم کے حامی ہیں، ان کا خیال ہے کہ میں ان کے حقوق چھین کر ان کے اوپر ظلم کر رہا ہوں، حالانکہ میں خدا سے اس بات کی پناہ مانگتا ہوں کہ میں کسی کے اوپر کوئی ظلم کروں، اگر میں کوئی ایسی چیز جو ان کی ملکیت میں ہوتی اسے چھین کر دوسروں کو دے دیتا تو یہ البتہ میری شقاوت اور میری بدبختی ہوتی مگر میرا خیال ہے، اگر میں نے کسریٰ[1] کی اس سرزمین کو تقسیم کر دیا تو آیندہ کوئی حصہ فتح نہ کیا جا سکے گا (کیونکہ اس کے اخراجات کی کوئی دوسری صورت نہیں ہے) اس لیے میری رائے ہے کہ تمام اراضی کو ان کے مالکوں کے ہاتھوں میں رہنے دیا جائے، اور ان کے اوپر جزیہ و خراج عائد کر دیا جائے اور اس سے جو آمدنی ہو اس سے فوجیوں، معصوم بچوں اور آیندہ آنے والی نسل سب کو فائدہ پہنچایا جائے،

کیا آپ لوگوں نے اس پر غور کیا ہے کہ اسلامی مملکت کی سرحدوں کے لیے ایک مستقل فوج کی ضرورت ہے، جو وہاں ہر وقت پڑی رہے، کیا آپ لوگوں نے اس پہلو پر بھی سوچا ہے کہ اسلامی مملکت کے بڑے بڑے خطے اور شہر مثلاً جزیرہ، شام، کوفہ بصرہ اور مصر کی حفاظت کے لیے بھی ایک مستقل فوج کی ضرورت ہے، اگر میں یہ سرزمین اس کے مالکوں سمیت فوجیوں میں تقسیم کردوں تو اتنی بڑی فوج کا خرچ کہاں سے آئیگا،

ان مصالح کا ذکر کرنے کے بعد پھر فرمایا کہ

میں نے جو کچھ فیصلہ کیا ہے وہ اپنے جی سے نہیں بلکہ کتاب اللہ کی روشنی میں ایسا کیا ہے پھر انھوں نے سورہ حشر کی وہ آیات پڑھیں جو اوپر درج کی جا چکی ہیں، پہلی آیت وما

---

[1] یہ علاقہ اس وقت ایرانیوں کے قبضہ میں تھا، اور ان ہی سے مسلمانوں نے لیا تھا، [2] اور ممکن ہے کہ زمین کے مالک یہ علاقہ چھوڑ دیں اور ساری زمین بیکار ہو جائے،

افاء اللہ علی رسولہ منھم پڑھنے کے بعد فرمایا کہ یہ بنو نضیر کے بارے میں نازل ہوئی اور آگے والی آیت ما افاء اللہ علی رسولہ من اھل القریٰ، آیندہ فتح ہونے والی تمام بستیوں کے لیے ہے، اسکے بعد خدا نے مہاجرین کا ذکر کیا، پھر ان ہی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ انصار کا بھی ذکر کیا، پھر اس پر بھی اکتفا نہیں کیا، بلکہ آخر میں یہ کہا کہ

| | |
|---|---|
| والذین جاؤا من بعدھم | ان کے بعد جو آئیں، |

ان آیات کی تلاوت و تفسیر کرنے کے بعد آخری ٹکڑے کے بارے میں فرمایا کہ

| | |
|---|---|
| فکانت ھذہ عامۃ لمن جاء من بعدھم فقد صار ھذا الفئ بین ھؤلاء جمیعاً فکیف نقسم ھم لھؤلاء وندع من تخلف بعدھم بغیر قسم[1] | اس آیت سے ان تمام لوگوں کا حق بھی ثابت ہوتا ہے جو آیندہ آئیں گے تو جب اس میں حاضر غائب سب کا حق ہے تو پھر ہم صرف ان موجودہ لوگوں میں اسے کیسے تقسیم کر دیں، اور جو ان کے بعد آنے والے ہیں، ان کو محروم کر دیں، |

پھر کیلا یکون دولۃ بین الاغنیاء منکم سے استدلال کرتے ہوئے فرمایا کہ

| | |
|---|---|
| لو قسمتھا بینھم فصارت دولۃ بین الاغنیاء منکم[2] | اگر میں انکے درمیان اسکو تقسیم کر دوں تو یہ سرزمین چند دولتمندوں کی جاگیر بن کر ان ہی میں گردش کرتی رہے گی۔ |

اس تقریر کے بعد پورے مجمع نے حضرت عمرؓ کی رائے سے اتفاق کیا،

کیا حضرت عمرؓ کی یہ تقریر پڑھنے کے بعد کوئی شخص یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے خلاف کوئی فیصلہ کیا؟ یا کسی متفقہ اسلامی حکم کو پس پشت

---

[1] کتاب الخراج امام ابو یوسف [2] احکام القرآن جصاص تشریح سورۂ حشر



ڈال کر ایک نیا اجتہاد کیا، اس تقریر کے ایک ایک حرف سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے یہ فیصلہ کتاب اللہ کی تصریحات سے مجبور ہو کر کیا، پھر حضرت عمرؓ نے جن اجتماعی مصالح کا ذکر کیا ہے وہ خود اپنی جگہ پر اتنے اہم تھے کہ اس کے علاوہ کوئی فیصلہ کرنا اسلامی مملکت کو ختم کرنے اور جہاد کی روح کی بالکلیہ کو روک دینے کے ہم معنی تھے،

یہاں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے اس موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس طرز عمل کا ذکر کیوں نہیں کیا جو آپ نے بنو نضیر، خیبر، مکہ اور طائف وغیرہ میں اختیار فرمایا تھا، اس کی وجہ یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانہ میں جن اجتماعی مصالح کے پیش نظر مختلف طرز عمل اختیار فرمایا تھا، ان کو نہ سمجھنے اور ان کے ہر پہلو پر نظر نہ ہونے ہی کی وجہ سے تو یہ اختلاف رونما ہوا تھا، اس لیے اس اختلاف کو ختم کرنے کے لیے ضرورت تھی کہ کتاب اللہ سے کوئی محکم دلیل پیش کر دی جائے، تاکہ پھر کسی کو چون و چرا کی گنجایش باقی نہ رہے، اور حضرت عمرؓ نے یہی کیا،

**(۲) چوروں کی سزا کا منسوخی** قرآن نے چوری کی سزا میں ایک ہاتھ کاٹ لینے کا حکم دیا ہے، چنانچہ اس حکم کے پیش نظر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت صدیقؓ نے ہمیشہ چوروں کو یہ سزا دی، مگر حضرت عمرؓ کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے قحط کے زمانہ میں اس سزا کو بند کر دیا تھا،

اگر حضرت عمرؓ نے قطع ید کی سزا کو مطلقاً بند کر دیا ہوتا تو یقیناً یہ کہا جا سکتا تھا کہ حضرت عمرؓ نے کتاب و سنت کے ایک ثابت شدہ حکم میں اپنے اجتہاد سے تبدیلی کی، مگر اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ حضرت عمرؓ نے یہ سزا مطلقاً منسوخ نہیں کی، بلکہ قحط کے زمانہ میں ملتوی کیا تھا، اب یہاں یہ سوال ہو سکتا ہے کہ کیا حضرت عمرؓ کو مطلقاً نہ سہی قحط کے زمانہ میں اس سزا کو بند کر دینے کا حق تھا؟ کیا کتاب و سنت میں اس کی کوئی دلیل و مثال موجود ہے؟ آیندہ سطروں میں ہمیں اسی سوال کا جواب دینا ہے،

حضرت عمرؓ نے جس قحط میں چوروں کا ہاتھ کاٹنا بند کر دیا تھا، اس کی ہلاکت خیزی کا حال یہ تھا کہ پورے جزیرہ میں خاک اڑنے لگی تھی، سرسبزی اور شادابی کا نام و نشان تک باقی نہ تھا، فقر و فاقہ کی وجہ سے لوگ مردار اور چمڑے تک کھا جاتے تھے، اسی ہلاکت خیزی کی وجہ سے اس قحط کا نام عام الرمادہ پڑ گیا تھا، رماد خاک اور راکھ کو کہتے ہیں، یعنی اس قحط میں ہر طرف خاک ہی خاک اڑتی نظر آرہی تھی، اور لوگ فقر و فاقہ کی وجہ سے زمین سے لگ گئے تھے، اور ان کے چہرے اور جسم کا رنگ تک سیاہ پڑ گیا تھا۔

یہ قحط ۱۸ھ میں پڑا تھا، اور اس نے پورے جزیرہ عرب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا، اور اس کا سلسلہ تقریباً چھ سات ماہ تک رہا، اس میں عام باشندوں کا حال یہ تھا کہ وہ گھاس پھوس میں نہیں بلکہ مردار، چمڑے اور ہڈی کا ستو کھانے پر مجبور ہو گئے تھے۔

حضرت عمرؓ ایک دن قحط کے انتظام کے سلسلہ میں گشت لگا رہے تھے، کہ مدینہ کے قریب کچھ خانہ بدوش لیٹرے یا دشمن قسم کے لوگ[1] نظر آئے، آپ نے ان سے دریافت کیا کہ تم لوگ یہاں کیسے آئے، بولے کہ فقر و فاقہ کی شدت نے مدینہ کے قریب آنے پر مجبور کیا[2]، اس کے بعد ان لوگوں نے ایک مردار جانور کی بھنی ہوئی کھال نکالی، اور اس کی ہڈیوں کو نکال کر اس کا ستو بنانے لگے تاکہ اس کو کھائیں، حضرت عمرؓ نے یہ کیفیت دیکھی تو چادر بچھا کر وہیں بیٹھ گئے، خود اپنے اہتمام میں ان کے لیے کھانا پکوایا اور ان کو اپنے سامنے کھلایا، پھر اپنے خادم اسلم کو مدینہ بھیجکر چند اونٹ اور کچھ کپڑے منگوائے، اور ان کو کپڑا پہنا کر اور اونٹوں پر سوار کر کے وہاں سے واپس کیا[3]۔

---

۱؎ اصل میں لفظ محاربین استعمال ہوا ہے جس کے معنی دونوں ہو سکتے ہیں ۲؎ یا تو ان کا ارادہ لوٹ مار کا تھا یا پھر مدینہ کے قریب اس غرض سے آئے ہونگے کہ شاید یہاں کفاف کا کوئی انتظام ہو سکے ۳؎ ازالۃ الخفاء ج ۲ ص ۱۵۴



جب تک قحط کا سلسلہ رہا حضرت عمرؓ دن بھر روزے سے رہتے تھے، حکم تھا کہ ان کے سامنے گیہوں کی روٹی اور گھی نہ لایا جائے، بلکہ صرف زیتون کا تیل اور جو کی روٹی لائی جائے، اسلم کا بیان ہے کہ ہم لوگ آپس میں کہا کرتے تھے کہ اگر خدا نے جلد قحط کی کیفیت دور نہ کی تو حضرت عمرؓ ہلاک ہو جائیں گے[1]۔

اس قحط سالی کے رفع کرنے کے سلسلہ میں جو تدبیریں اختیار کی گئی تھیں، ان سے پتہ چلتا ہے کہ حکومت کی ساری مشنری اس میں لگا دی گئی تھی، اور سارے ذرائع اس کے لیے وقف کر دیے گئے تھے، شاہ ولی اللہ صاحب نے لکھا ہے کہ اس سلسلہ میں حسب ذیل تدبیریں اختیار کی گئیں:

(۱) بیت المال میں جو کچھ تھا وہ سب غربا و مساکین پر تقسیم کر دیا گیا (۲) احتکار کرنے والوں کو سختی سے ذخیرہ اندوزی کرنے سے روکا گیا (۳) تمام ممالک محروسہ کے امرا کو مدینہ غلہ بھیجنے کا حکم دیا گیا، تاکہ مستحقین میں مفت تقسیم کیا جائے، چنانچہ اس حکم کے مطابق شام کے حضرت ابوعبیدہؓ نے غلہ سے لدے ہوئے چار ہزار اونٹ بھیجے، حضرت عمرو بن عاصؓ نے مصر سے بحر قلزم کے راستہ سے ایک سو کشتی غلہ روانہ کیا، (۴) اس پوری مدت میں خود حضرت عمرؓ نے نہ گوشت، گھی، گیہوں کھایا، اور نہ دودھ کا ایک قطرہ چکھا، ظاہر ہے کہ اس کا اثر دوسروں پر بھی پڑا ہوگا۔

یعقوبی کا بیان ہے کہ روزانہ سیکڑوں اونٹ ذبح کیے جاتے تھے اور ان کا گوشت پکا کر مستحقین کو کھلایا جاتا تھا، غلہ کی مفت تقسیم کا باقاعدہ انتظام کیا گیا تھا[2]۔

حضرت عمرؓ نے عام اعلان کرا دیا تھا کہ اگر خدا نے اس قحط سے جلد نجات نہ دی تو ہر کھاتے پیتے گھر میں چند غریبوں اور قحط زدوں کو بھیج دوں گا، تاکہ وہ اپنے کھانے میں ان کو شریک کر لیا کریں، کیونکہ ایک آدمی کا کھانا دو آدمی کھا لیں گے، تو دونوں ہلاکت سے بچ جائیں گے[3]۔

---

۱؎ سیرت عمرؓ بن الخطاب ابن جوزی ص ۶۹ ۲؎ ایضاً ص ۷۰ ۳؎ ایضاً ص ۷۰

یہ اس قحط کی مختصر کیفیت بیان کی گئی ہے جس میں حضرت عمرؓ نے قطع ید کی سزا کو منسوخ نہیں بلکہ ملتوی کر دیا تھا۔

سور نجس العین ہے، مگر قرآن نے ایک بھوکے مضطر کو سد رمق کے بقدر اس کا گوشت بھی کھا لینے کی اجازت دی ہے، شراب، مردار، وغیرہ کو قرآن نے قطعی حرام قرار دیا ہے، مگر یہ چیزیں بھی ان لوگوں کے لیے بقدر سدِ رمق حلال ہیں جو فقر و فاقہ کی وجہ سے موت کے منہ میں جا پہنچے ہوں۔

غور کرنے کی بات ہے جس قحط میں لوگوں کے اضطرار کی حالت یہ ہو کہ وہ گھاس پھوس نہیں، بلکہ ہڈی اور مردار کھا کر پیٹ بھرنے پر مجبور رہوں، اور بھوک و فاقہ کی وجہ سے زمین سے لگ گئے ہوں، اور ہزاروں من غلہ اور گوشت مفت تقسیم کرنے کے بعد بھی لوگوں کے موت کے پنجے سے بچنے کی کوئی صورت نہ ہو، اور حضرت عمرؓ ان کو موت سے بچانے کے لیے یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہو گئے ہوں کہ ایک ایک دو دو فاقہ مستوں کو ہر کھاتے پیتے گھر میں بھیج دیا جائے گا، ایسی صورت میں حضرت عمرؓ السارق والسارقۃ کے حکم کے تحت ان لوگوں کے ہاتھ کاٹتے جو اپنے کو موت سے بچانے کے لیے چوری پر مجبور ہو گئے تھے، یا وہ فمن اضطر غیر باغ ولا عاد فلا اثم علیہ والی آیت کے تحت ان کو مضطر قرار دیکر قطع ید کی سزا کو تھوڑے دن کے لیے ملتوی کر دیتے، اس موقع پر شریعت کے دو حکموں میں سے کس حکم کو ترجیح دینا شرعی مصلحت کے مطابق تھا، کیا سزا کا موقوف کرنا منشائے قرآنی کے زیادہ مطابق تھا یا اس کو نافذ کرنا؟

پھر یہ بھی غور کرنے کی بات ہے کہ قرآن نے چوروں کے ہاتھ کاٹنے کا جو حکم دیا ہے، وہ بالکل مطلق ہے تو کیا اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اگر کوئی کسی کی ایک سوئی، ایک ورق کاغذ، ایک مٹھی صابن چرالے تو اس کا ہاتھ بھی کاٹ دیا جائے گا، قرآن کا یہ منشا ہرگز نہیں ہے یہی



وجہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے معمولی چیزوں کے بارے میں فرمایا ہے کہ ان کی چوری میں ہاتھ نہیں کاٹا جا سکتا۔

مروان کے زمانہ میں کسی غلام نے کسی کی تھوڑی سی کھجور چرالی، کھجور والے نے مروان کے پاس دعویٰ کیا، مروان نے غلام کو قید کر دیا، اور ارادہ کیا کہ اس کا ہاتھ کاٹ دیں، اس غلام کا مالک ایک معروف صحابی رافع بنؓ خدیج کے پاس گیا، اور شرعی حکم دریافت کیا، انھوں نے کہا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ لا قطع فی ثمر ولا کثر، پھل اور کھجور کی چوری میں ہاتھ نہیں کاٹا جا سکتا، مالک حضرت رافعؓ کو لیکر مروان کے یہاں پہنچا اور اس کو یہ حدیث نبوی سنوائی، مروان نے فوراً غلام کو رہا کر دیا۔

(ابو داؤد مع معالم السنن)

اس حدیث کی روشنی میں ائمہ نے یہ اجتہاد کیا ہے کہ دودھ، پکے ہوئے کھانے، تازہ پھل اور گوشت پرند وغیرہ کی چوری میں ہاتھ نہیں کاٹا جا سکتا۔ حضرت عمرو بنؓ عاص نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک بار درخت میں لگے ہوئے پھل کے بارے میں دریافت کیا تو آپ نے فرمایا،

| | |
|---|---|
| ما اصاب منہ من ذی حاجۃ | اگر کوئی ضرورت سے مجبور ہو کر کچھ پھل کھا لے |
| غیر متخذ خبنۃ فلا شیٔ علیہ [1] | تو اس پر کوئی سزا نہیں ہے، البتہ اس کو گٹھری باندھ کر گھر نہ لیجانا چاہیے، |

یہ فرمانے کے بعد آپ نے ایک اصول مقرر فرما دیا:

| | |
|---|---|
| ومن سرق شیئاً بعد ان یوؤیہ | غلہ و پھل کے کھلیان یا گھر میں پہنچ جانے کے بعد |

---

[1] اگر وہ ایسا کرے گا تو پھر اس کو کچھ سزا بھی دیجائے گی اور اس سے تاوان بھی لیا جائے گا۔

| | |
|---|---|
| الجرین فبلغ المجن فعلیہ القطع | جو شخص اس میں چوری کرے گا تو اگر ایک |
| | ڈھال[1] کی قیمت کے بقدر چوری کی، تو |
| (ابوداؤد) | اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے گا، |

پہلے جملہ میں تو آپ نے اہل ضرورت کے بارے میں فرمایا کہ اگر وہ بغیر اجازت کسی باغ سے پھل وغیرہ کھالیں تو کوئی مضائقہ نہیں ہے، البتہ باندھکر گھر لیجانے کی کوشش نہ کرنی چاہیے، دوسرے جملہ میں فرمایا کہ اگر کسی نے پھل یا غلہ کاٹ کر یا توڑ کر کھلیان یا گھر میں رکھ لیا ہے، تو پھر اس کی چوری میں ہاتھ اس وقت کاٹا جائے گا جب وہ چار چھ روپیہ کی قیمت کا ہو، دو چار آنے میں ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا،

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بغیر ضرورت دو چار آنے کی چیز چرانے والے کو کوئی سزا نہ دیجائے گی، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس میں ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا،

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جب قرآن کے عام حکم کے تحت اتنی تخصیص فرمائی ہے کہ اگر کوئی حاجتمند چھوٹی موٹی چیزیں بغیر اجازت استعمال کرلے یا چرالے تو اس کو کوئی سزا نہیں دیجا سکتی تو جب عام الرمادہ میں لوگ اس سے زیادہ محتاج و ضرورت مند تھے، اور حضرت عمرؓ نے قطع ید کی سزا ملتوی کردی تو ان کا یہ فیصلہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے خلاف کیسے ٹھہر گیا، یہ تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تبیین و تخصیص کے عین مطابق تھا،

حضرت عمرؓ کے اس فیصلہ کی وضاحت کے لیے ان کے ایک دوسرے فیصلہ پر بھی نظر ڈال لینی چاہیے، جو انھوں نے اہل اضطرار کے بارے میں فرمایا تھا،

قبیلہ مزینہ کے ایک شخص کی ایک قیمتی اونٹنی حاطب بن بلتعہ کے غلاموں نے چرائی،

[1] ڈھال کی قیمت کے بارے میں ائمہ مختلف الرائے ہوگئے ہیں، امام ابو حنیفہؒ نے دس درہم سرقہ کا نصاب مقرر کیا ہے اور ائمہ ثلاثہ نے تین درہم،



مگر وہ پکڑے گئے، اونٹنی کا مالک ان کو لیکر حضرت عمرؓ کی خدمت میں آیا، حضرت عمرؓ کے سامنے غلاموں نے چوری کا اقرار کرلیا، حضرت عمرؓ نے ان کے مالکوں کو بلاکر واقعہ کی اطلاع دی، اور کثیر بن الصلت کو بلایا اور حکم دیا کہ ان کا ہاتھ کاٹ لو، یہ حکم دینے کے بعد ہی حضرت عمرؓ کو علم ہوا کہ غلاموں نے فقر و فاقہ سے مجبور ہوکر یہ غلط قدم اٹھایا تھا، حضرت عمرؓ نے غلاموں کے مالک کو بلوایا اور ان سے مخاطب ہوکر فرمایا کہ مجھے اس بات کا علم نہ ہوتا کہ تم ان سے کام لیتے ہو اور ان کو اتنا فاقہ مست رکھتے ہو کہ ان میں سے کوئی حرام چیز کھالے تو اس کے لیے حلال ہوجائے، تو میں ان کا ہاتھ ضرور کاٹ دیتا، مگر اب ان کا ہاتھ کاٹنے کے بجائے تم کو سزا دونگا، چنانچہ مالک سے اونٹنی کی قیمت پوچھکر ان سے اس کی قیمت دلوائی،[1]

آخر میں ہم حافظ ابن قیم کا وہ تبصرہ نقل کرتے ہیں جو انھوں نے حضرت عمرؓ کے اس فیصلہ پر کیا ہے، لکھتے ہیں:

| | |
|---|---|
| فان السنة اذا كانت سنة | قحط کے زمانہ میں فقر و فاقہ کی شدت عام |
| مجاعة وشدة غلب على الناس | آدمیوں کو اتنا مجبور اور ضرورتمند بنا دیتی |
| الحاجة والضرورة فلا يكاد | ہے کہ چور کے لیے بھی یہ ممکن نہیں رہتا کہ وہ |
| يسلم السارق من ضرورة | سد رمق کے لیے چوری سے محفوظ |
| تدعو ما يسد به رمقه | رہ سکے، |

پھر ایک طویل بحث کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

| | |
|---|---|
| وهو مأذون له في مقابلة صاحب | چور کو یہ ڈھیل صرف ان دولتمندوں کے |
| المال على اخذ ما يسد رمقه | مقابلہ میں دی گئی ہے کہ انکا مال وہ اس طرح |

[1] اعلام الموقعین ج ۲ ص ۲۳

وعام المجاعة یکثر فیه المحاویج
والمضطرون. ولا یتمیز المستغنی
منهم والسارق بغیر حاجة
فاشتبه من یجب علیه الحد
بمن لا یجب علیه فدرئ
لعما اذا بان ان السارق
لا حاجة به وهو مستغنی عن
السرقة قطع ۲

لیکن اپنے جسم و جان کے رشتہ کو قائم رکھ سکیں
(اور پھر یہ بات بھی ذہن نشین رہنی چاہیے کہ)
قحط کے زمانہ میں ضرورت مندوں، بھوکوں
اور مضطروں کی کثرت ہوتی ہے اور اس
زمانہ میں یہ تمیز کرنا سخت مشکل ہوتا ہے کہ
کون مستغنی ہے اور ضرورت کے بغیر اس نے
چوری کی ہے، اور کس نے واقعی ضرورت سے
مجبور ہو کر چوری کی ہے۔ اس اشتباہ کی وجہ سے سزا ملتوی کر دی گئی
البتہ جب یہ واضح ہو جائے کہ چوری کرنے والے
کو واقعی اس غلط اقدام کی کوئی ضرورت نہیں
تھی تو اس کا ہاتھ ضرور کاٹ دیا جائے گا۔

ان تفصیلات سے حسب ذیل باتیں معلوم ہوئیں،

(۱) حضرت عمرؓ نے اس سزا کے التوا کا حکم اس لیے دیا کہ قحط کی حالت ایک اضطرار کی حالت ہوتی ہے جس میں آدمی سد رمق کے لیے حرام کھانے پر بھی مجبور ہو جاتا ہے، جیسا کہ حضرت عمرؓ نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، اس لیے قرآن کی رخصت کے مطابق اہل اضطرار سے درگذر کرنا ضروری تھا، اب ظاہر ہے کہ اس رخصت اور درگذر کے ساتھ اجرائے حد کا کوئی موقع نہیں رہ جاتا،

(۲) سزا کے التوا کا عام حکم اس لیے دیا گیا کہ اس وبائے عام کے وقت اہل حاجت اور غیر اہل حاجت

لہ اشارہ ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی طرف جس میں آپ نے فرمایا کہ شبہ کی حالت میں حد کے اجرا سے باز رہو۔ ۲ اعلام الموقعین ج ۳ ص ۲۳



یا مضطر اور غیر مضطر میں فرق کرنے کا نہ تو موقع ہی تھا اور نہ یہ ممکن ہی تھا، اس لیے اس اشتباہ کی حالت میں ارشاد نبوی ادرءوا الحدود بالشبہات کے تحت عام درگذر ہی سے کام لینا مناسب تھا،

(۳) اگر کسی کے بارے متعین طور پر یہ معلوم ہو جاتا کہ اس نے بغیر کسی شدید ضرورت کے چوری کی ہے تو اس کا ہاتھ قطعی کاٹ دیا جاتا

(۴) سزا کا التوا صرف زمانہ قحط تک تھا، اس کے بعد پھر اس پر اسی طرح عمل درآمد کیا گیا جس طرح اس سے پہلے ہوتا تھا۔

کیا ان تفصیلات کے بعد بھی یہ کہنے کی گنجایش رہ جاتی ہے کہ حضرت فاروقؓ کا یہ فیصلہ کتاب و سنت کے خلاف تھا؟ (باقی)

# قاسم کاہی کے حالات و کلام پر روشنی

از ڈاکٹر نذیر احمد صاحب اسسٹنٹ ڈائرکٹر علی گڈھ ہسٹری آف اردو لٹریچر مسلم یونیورسٹی

قاسم کاہی فارسی کا قابل ذکر شاعر گزرا ہے، جس نے ہمایوں اور اکبر کے زمانے میں ناموری حاصل کرنے کے بعد اکبری عہد کے پچیسویں سال یعنی ۹۸۸ھ میں وفات پائی، مدتوں اس شاعر پر کسی نے کوئی توجہ نہیں کی، پروفیسر مسعود حسن رضوی کے پاس کاہی کے ایک (ناقص) قلمی دیوان کی دریافت نے ڈاکٹر ہادی حسن کی توجہ اس طرف مبذول کرائی، چنانچہ انھوں نے کاہی کے حالات بڑی توجہ سے جمع کیے، اور ایک طویل مقالہ ۱۹۵۳ء میں اسلامک کلچر کے تین شماروں میں شائع کیا، یہ مقالہ بعد میں کتاب[1] کی شکل میں بھی مدون ہو گیا، جو بڑی سائز کے ۹۴ صفحات پر مشتمل ہے، ڈاکٹر ہادی حسن نے جن ماخذوں سے کام لیا ہے، ان میں حسب ذیل خصوصیت قابل ذکر ہیں،

۱- نفایس المآثر، مصنف علاء الدولہ کامی سال تالیف ۹۷۳ھ تا ۹۸۲ھ

۲- منتخب التواریخ بدایونی " ۱۰۰۴ھ

۳- طبقات اکبری نظام الدین احمد " ۱۰۰۱ھ

[1] یہ کتاب جولائی ۱۹۵۵ء میں شائع ہوئی ہے۔ تین سال بعد ڈاکٹر موصوف نے اس کا دیوان بھی شائع کیا۔ اور اس کے گم شدہ اشعار کے پتہ چلانے میں تحقیق کا حق ادا کیا ہے۔ دیوان میں کل ۱۳۰۵ بیت اور ایک مصرع تھا، ڈاکٹر صاحب نے ۲۳۴ بیت اور ایک مصرع کا اور اضافہ کیا۔



۴- ہفت اقلیم مصنف امین احمد رازی سال تالیف ۱۰۰۲ھ

۵- آئین اکبری ابو الفضل " ۱۰۰۵ھ

ان میں بیشتر مصنفین نے قاسم کاہی کو دیکھا تھا، اس لیے ان کے بیان نہایت مستند ہیں، ان کے علاوہ اور بھی دوسرے معاصرین اور غیر معاصرین کے بیان سے حالات کے مرتب کرنے میں مدد لی گئی ہے،

ڈاکٹر ہادی حسن کو اس ضمن میں سب سے زیادہ مدد ہفت اقلیم سے ملی ہے، اور غالباً صرف یہی مصنف ہے جس کی قاسم کاہی سے ملاقات نہ ہو سکی ہوگی[1]، مگر سب سے زیادہ دلچسپ اور مفصل حالات اسی نے بہم پہنچائے ہیں، ڈاکٹر صاحب کے بیان کا خلاصہ چند سطروں میں پیش کیا جاتا ہے،

قاسم کاہی کی وفات کا سنہ ۹۸۰ھ اور ۹۸۸ھ بتایا گیا ہے، مگر آخر الذکر تاریخ زیادہ صحیح ہے، اسی طرح عمر ۱۱۰ اور ۱۲۰ سال تجویز ہوئی ہے جس میں آخر الذکر کے لیے وجہ ترجیح حاصل ہے، اس حساب سے ولادت کا سنہ ۸۶۸ ہجری ہوگا، وہ میاں کال میں پیدا ہوا جو سمرقند اور بخارا کے درمیان ایک کوہستانی علاقہ ہے، ۸۸۳ھ میں وہ ہرات آیا اور جامی سے ملاقات کی، اس کے بعد وہ کابل آیا، جہاں تقریباً نصف صدی قیام رہا، ۹۳۵ھ کے قریب وہ بھکر آیا، اس وقت وہاں کا بادشاہ شاہ حسن تھا، وہاں اس نے میر ہاشم کرمانی سے کسب فیوض کیے، ۹۴۰ھ کے قریب وہ سومنات میں تھا، اطراف سومنات و گجرات میں اس کا قیام ۹۴۰ھ سے ۹۵۶ھ تک رہا ہوگا، اس سنہ میں وہ پھر کابل لوٹ گیا، اگرچہ ہفت اقلیم سے ظاہر ہوتا ہے کہ کاہی بھکر ہی سے دربار اکبری

[1] اس مصنف کے ہندوستان آنے کا یقین تو ہے، مگر قیام کی تفصیل بالکل نہیں ملتی۔ ۹۸۸ھ تک شاید نہ آیا ہو، مگر اسکو بہت سے مستند ذرائع سے حالات معلوم ہوئے ہونگے، اگرچہ وہ ضرور آیا تھا اور وہیں قاسم کاہی نے زندگی کے آخری ایام گذارے تھے اور یہیں اسکی آرام گاہ بھی ہے،

میں آیا، مگر ڈاکٹر ہادی حسن اس کی تکذیب اس بنا پر کرتے ہیں کہ بایزید کی تاریخ ہمایوں و اکبر میں کاہی کا نام ۹۶۱ھ میں شاہزادہ اکبر کے ہمراہ کابل سے آنے والے امرا کی فہرست میں ملتا ہے، کاہی ہمایوں کی بازیابی سلطنت کے ساتھ ہی اس سے منسلک ہوجاتا ہے، چند دنوں بعد وہ بہادر خان اور خان زمان کے ساتھ جونپور اور بنارس میں ملتا ہے، گمان غالب ہے کہ ۹۶۴ھ سے ۹۶۹ھ تک کاہی کا قیام ان اطراف میں رہا ہوگا، ۹۶۹ھ میں وہ آگرہ آجاتا ہے اور اس کے بعد وہ آخر عمر تک اکبری دربار سے منسلک رہتا ہے، اکبر اعظم کے غیر معمولی نوازشات کا ایک واقعہ یہ ہے کہ "قصیدۂ لازم فیل" کے لکھنے پر ایک لاکھ تنکہ اس کو انعام دیا جاتا ہے جس کے پانچ ہزار روپئے ہوتے ہیں، اس کے بعد شاہی حکم ہوتا ہے کہ کاہی کے ورود دربار کے موقع پر ہر بار ایک ہزار روپیہ انعام دیا جائے، مگر یہ بات آزاد منش شاعر پر گراں گزرتی ہے اور وہ دربار میں آنا جانا موقوف کر دیتا ہے،

ڈاکٹر ہادی حسن نے تقریباً تمام اہم ماخذوں سے استفادہ کر لیا ہے، مگر ایک تذکرہ کی طرف ان کی توجہ نہ ہوسکی، وہ مشہور تذکرہ خلاصۃ الاشعار[1] ہے جس کے مولف تقی الدین کاشی نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اسی تذکرہ پر صرف کیا تھا، ۹۸۵ھ تک دسویں صدی تک کے شعرا کے حالات ۴ جلدوں میں لکھے، ۹۹۳ھ میں ایک خاتمہ کا اضافہ کیا جس میں صرف معاصرین کے حالات تھے، یہ حصہ سب سے زیادہ ضخیم اور مستند تھا، مگر مولف نے اضافہ کا کام جاری رکھا، ۱۰۱۱ھ میں پھر ایک ایڈیشن تیار ہوگیا، ۱۰۱۶ھ میں آخری ایڈیشن نکلا، مصنف نے خود

---

[1] ملاحظہ ہو اسپرنگر فہرست اودھ ص ۱۳، جرنل رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن (اولڈ سیریز) ج ۹ ص ۱۲۶، اور میرا مضمون معارف ماہ نومبر ۱۹۵۳ء اور جولائی ۱۹۵۶ء



اس کے کئی خلاصے کیے، خاتمہ کا ایک خلاصہ لکھا جس کا ایک نسخہ جو خود مصنف نے ۱۰۱۳ھ میں لکھا تھا، ایران کے مجلس شورائے ملی کے کتابخانے میں موجود ہے، اسی خاتمے سے ۴۸ شاعروں کا ایک دوسرا انتخاب تہران کے کتابخانۂ ملی ملک میں موجود ہے، جو ۱۰۱۳ھ میں مصنف کی نظر سے گزر چکا ہے، خود مصنف نے پورے خلاصۃ الاشعار مع خاتمہ کا خلاصہ اس طرح تیار کیا کہ اس میں انتخاب کلام بالکل نہیں ہے، اس طرح کے دو نسخوں کا علم ہے، ایک اسپرنگر نے اودھ کے کتابخانے میں پایا تھا، اور دوسرا انڈیا آفس کے کتابخانے[2] میں ہے جس کی ایک نقل راقم الحروف کے پیش نظر ہے، اس تفصیل سے اندازہ ہوگا کہ دسویں صدی کے شاعروں کے حالات کے ضمن میں اس تذکرہ کا مطالعہ ناگزیر ہے، تعجب ہے کہ ڈاکٹر ہادی کی نظر یہاں تک نہ گئی، انھوں نے رام پور کے کتاب خانے کے نفایس المآثر کا مطالعہ تو کیا، مگر اسی کتاب خانے کے خلاصۃ الاشعار کے مطالعے کا ان کو موقع نہ مل سکا حسن اتفاق سے اس کے پہلے ایڈیشن یعنی ۹۹۳ھ والے نسخے کا ایک مخطوطہ ایسا ہے جس کی کتابت بھی ۹۹۳ھ ہی میں ہوئی تھی، گویا اصلاً یہی نسخہ اس تذکرہ کا قدیم ترین نسخہ ہے، اس کی اہمیت اس لحاظ سے اور بھی ہے کہ قاسم کاہی کے سلسلے میں جو بھی مخطوطے مطالعہ میں آئے، ان میں کوئی بھی اتنا قدیم نہ ہوگا، یہ اہم مخطوطہ اسپرنگر کے بیان[1] کے مطابق مسٹر ہال کے پاس بنارس میں تھا، آجکل وہ انڈیا آفس[2] کے کتابخانے میں ہے، میرے پاس اس کی ایک نقل موجود ہے، اس میں قاسم کاہی کے متعلق بعض نہایت مفید و دلچسپ باتیں درج ہیں، جن کو ذیل میں پیش کیا جاتا ہے،

---

[1] فہرست اودھ ص ۴، [2] انڈیا آفس کی فارسی مخطوطات کی فہرست میں اس کا نمبر ۶۶۸ ہے

[2] فہرست میں اس کا نمبر ۶۶۰ ہے

ڈاکٹر ہادی حسن کو کاہی کے اجداد کے متعلق معلومات فراہم نہیں ہو سکی تھیں، انھوں نے جو کچھ ابتدائی زندگی کے بارے میں لکھا ہے، وہ ہفت اقلیم سے ماخوذ ہے، مگر خلاصۃ الاشعار[1] میں اجداد کے متعلق حسب ذیل تفصیل ملتی ہے۔

سید ابو القاسم الشہیر بکاہی، اصل وی از سادات گلستان اصفہان است، آباؤ اجداد او در محلی کہ امیر کبیر امیر تیمور گورگان انار اللہ برہانہ، صفاہان را حکم قتل کرد ایشان از بیرون آمدہ بمعسکر تیموری پیوستند و امیر تیمور گورگان با ایشان انواع التفات مبذول داشت تا آنکہ در ماوراء النہر در شہر سغد متوطن گشتند۔

اس بیان سے صاف ظاہر ہے کہ تیمور کے حملے کے قبل کاہی کا خاندان اصفہان میں مقیم تھا، اب تیمور کے حملے اور وہاں کے قتل عام کا حال تاریخ مفصل ایران جلد اول مولفہ عباس اقبال آشتیانی (تہران ۱۳۱۲ھ ش ۴۳۷ - ۴۳۸) میں اس طرح بیان ہوا ہے:-

"۷۸۶ھ میں امیر تیمور گورگان نے جو تمام ماوراء النہر، ترکستان اور ایران کے بعض حصوں پر غلبہ حاصل کر چکا تھا، اپنا سفیر شیراز میں سلطان زین العابدین (۷۸۶ھ - ۷۸۹ھ) کے پاس روانہ کیا اور اس کو یہ پیغام بھیجا کہ چونکہ اس کے باپ شاہ شجاع نے اسے امیر تیمور کے سپرد کیا تھا، اس لیے وہ (زین العابدین) تیمور کے پاس آجائے، سلطان زین العابدین نے تیمور کے خط کا جواب ہی دیا اور نہ ایلچی ہی کو واپس جانے کی اجازت دی، چنانچہ امیر تیمور شوال ۷۸۹ھ میں ہمدان سے اصفہان آیا اور وہاں کے حاکم امیر مظفر الدین کاشی کو اپنا مطیع بنا لیا، سلطان زین العابدین بغداد بھاگ گیا، لیکن شاہ یحییٰ نے تیمور کی اطاعت قبول کرلی، امیر تیمور کے ماموروں نے اہل اصفہان سے ٹیکس وصول کرنے میں

[1] ورق ۲۲۲


معارف نمبر ۲ جلد ۸۱

جب ظلم و ستم سے کام لیا تو انھوں نے ماموروں کو قتل کر ڈالا، امیر تیمور کو جب اس واقعہ کی اطلاع ملی تو شہر کے قتل عام کا حکم دیا جس کے نتیجے میں ستر ہزار اصفہانی خونخوار امیر کے لشکریوں کی شمشیر کے لقمہ بن گئے" (ملخصاً)

زین العابدین کا باپ شاہ شجاع (۷۶۰ھ - ۷۸۶ھ) امیر مبارز الدین بانی سلطنت آل مظفر کا لڑکا تھا، وہ حافظ شیرازی کا اہم ممدوح بھی رہ چکا ہے، مرنے سے قبل اس نے ایک مراسلہ تیمور کو لکھا جس میں امیر مذکور سے اپنے لڑکوں کی سرپرستی کی درخواست کی تھی، یہ خط تاریخ مفصل ایران (ص ۴۳۴ - ۴۳۵) میں منقول ہے، شاہ یحییٰ، شاہ شجاع کا بھتیجا زین العابدین کے بعد شیراز کا بادشاہ ہوا، اور ۷۹۵ھ تک وہاں کی حکومت اس کے قبضے میں تھی، امیر مظفر الدین کاشی زین العابدین کا ماموں تھا[1]، آخر الذکر ہی کے حکم سے وہ کاشان کا حاکم ہوا تھا،

اس تفصیل سے ظاہر ہے کہ قاسم کاہی کے اجداد ۷۸۹ھ کے بعد کچھ دنوں تیمور کے لشکر میں شامل ہوئے، اور آخر میں ماوراء النہر آکر سغد میں آباد ہو گئے، خلاصۃ الاشعار[2] کے دوسرے نسخے میں "یکی از آباء و اجداد وی ...... با اولاد خود بمعسکر تیموری پیوست" ہے، جس سے یہ بات اور بھی صاف ہو جاتی ہے کہ قاسم کاہی کے اجداد میں سے ایک مخصوص آدمی تھا جو اپنی اولاد کے ساتھ تیموری لشکر میں شامل ہوا تھا، ظاہر ہے کہ وہ شخص براہ راست کاہی کے سلسلۂ نسب میں ہے،

اب سغد کے جائے وقوع کے بارے میں چند قول نقل کیے جاتے ہیں:

[1] تاریخ مفصل ایران ج ۱ ص ۴۳۷ [2] اس نسخے کی کتابت ۱۰۳۹ھ میں ہوئی تھی، ورق ۱۳۳۴

فرہنگ آنند راج[۱] میں سغد کے سلسلے میں حسب ذیل قول درج ہے:

سیاحاں نوشتہ اند کہ میتواں ہشت روز در ولایت سغد سفر کرد کہ از سایۂ اشجار
وباغستان وآبہای گوارا بیروں نتواں رفت حکیم فردوسی گفتہ

بمو بہ چہ خوش گفت دہقان سغد کہ برنا ید از خانہ باز چغد

در تواریخ آمدہ کہ سغد شہری آباد و بزرگ بودہ وشمر نامی از سرداران عرب آنرا
بقہر مسخر کردہ وخراب نمودہ وسمرقند را ساختہ ... واصل آں شمر کندہ بود اکنوں
بسمرقند مشہور است وسغد را بجہت قرب وجوار بسمرقند نسبت کنند چنانکہ سراج الدین
قمری گفتہ ؎

خطۂ از نذراں بغیر خداوند شد ز خوشی چوں فزای سغد سمرقند

یہ بیان ہفت اقلیم[۲] سے کس قدر مشابہ ہے، ممکن ہے یہ کتاب بھی مولف فرہنگ مذکور کے پیش نظر
رہی ہو یا دونوں کا ماخذ ایک ہی ہو: ماوراء النہر بہت آباد ملک ہے، اس کے مشرق میں فرغانہ،
مغرب میں خوارزم (خیوا)، شمال میں تاشکند (تاشقند) اور جنوب میں بلخ واقع ہے، آبادی
کی کثرت، غلہ کی افراط، میوے اور مویشیوں کی فراوانی کے لیے بیشتر ملکوں پر فوقیت رکھتا ہے
اور جیحوں اور سیحوں دریاؤں کے درمیان واقع ہے، جیحوں کا منبع صاحب ممالک ومسالک کے
نزدیک بدخشاں اور بعض کے نزدیک چغانیان کے پہاڑ ہیں، سیحوں کا منبع ترکستان میں ایک جگہ
ہے جو سیحون یاختہ ہے، سمرقند ماوراء النہر کا دار الخلافہ ہے، اس شہر کی بنیاد کیکاؤس بن کیقباد
نے ڈالی تھی، پرانے زمانے میں ایک قلعہ پچاس ہزار قدم کے دور میں تھا، رفتہ رفتہ وہ منہدم ہوگیا،
گرشاسپ کو وہاں ایک بارخزانہ ملا، اس سے اسکی مرمت کرائی، پھر گشتاسپ بن لہراسپ نے اس قلعہ کو دوبارہ آباد کرایا،
یہاں تک کہ شمر نے اسے ویران کر ڈالا اور اس کے بعد سے شمر کندہ کے نام سے مشہور ہوا، جو معرب

[۱] ج ۲ ص ۲۲۲، ۲۲۳۔ [۲] اقلیم پنجم، ورق ۸ و ۹ب (مخطوطہ لکھنؤ یونیورسٹی، سال کتابت ۱۲۰۸ھ)



ہوکر سمرقند ہوگیا، بعض لوگ ایک دوسری توجیہ پیش کرتے ہیں، شمر بن افریقش بن ابرہہ نے شرق
کی طرف کوچ کیا، اور اس وقت کے نہایت آباد شہر سغد کے ویران کرنے کا حکم دیا، اور اس کے
برابر ایک دوسرا شہر آباد کیا جس کو ترک سمرکند کہتے تھے[۱]، کیونکہ ترکی میں اس لفظ کے معنی دیوار
کے ہیں، مرور ایام سے یہ شہر سمرقند ہوگیا۔ (ملخصاً)

برہان قاطع کا بیان سنیے:

سغد نام شہری است از ماوراء النہر نزدیک بسمرقند، گویند آب وہوای آن در نہایت
لطافت باشد وآں بسغد سمرقند شہرت دارد وآں را بہشت دنیا ہم میگویند

غیاث اللغات میں اسی کے حوالے سے بیان ہوا ہے، اور فرہنگ کارتوزیاں (ص ۴۹۱)
ایران ۱۳۱۱ شمسی میں بھی ایسا ہی ملتا ہے:

سغد موضعی است قریب سمرقند کہ بواسطہ خوشی آب وہوا از جنات اربعہ شمردہ اند

تاریخ خواہ جو بھی کہے یہ حقیقت ہے کہ سغد اور سمرقند دو الگ الگ شہر ہیں، البتہ یہ
قیاس ہوسکتا ہے کہ پرانے زمانے کے مشہور شہر سغد کو برباد کردینے کے بعد اس کا ایک حصہ
باقی رہ گیا ہو، جو سمرقند کے نزدیک ہوگا، اور آج تک اسی کی نسبت سے ذکر ہوتا ہے،

اس حقیقت کے ذہن نشین ہونے کے بعد خلاصۃ الاشعار کا بیان کہ قاسم کاہی کے اجداد
سغد میں مقیم ہوگئے، ہفت اقلیم کے اس بیان سے متضاد نہیں ہے جس میں قاسم کاہی سمرقند
کے ذیل میں بیان ہوا ہے، کیونکہ سغد بہرحال سمرقند ہی کا ایک حصہ ہے، لیکن یہ بات یقیناً تسلیم
نہیں کی جاسکتی کہ قاسم کاہی کا سغد سے نہیں بلکہ سمرقند ہی سے تعلق تھا،

یہاں ایک بات کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے، دسویں صدی میں امیر تیمور کے متعلق

[۱] ص ۴۰ (کشوری)

اہل ایران میں آجکل کی طرح شدید مخالفت و نفرت کا جذبہ نہیں تھا، ورنہ وہ تیمور جس نے ایران کی اینٹ سے اینٹ بجادی تھی، اہل ایران کا محبوب نہیں ہو سکتا۔ تقی کاشی نے اس کے لیے "امیر کبیر" اور "انار اللہ برہانہ" جیسے مدحیہ فقرے لکھکر اپنی محبت کا ثبوت پیش کیا[۱] جبکہ موجودہ دور کے تاریخ کے مشہور پروفیسر مرحوم عباس اقبال آشتیانی[۲] اس کے لیے خونخوار کا لفظ لائے ہیں،

بہرحال امیر تیمور نے قاسم کاہی کے اجداد (یا جد اعلیٰ) کی بڑی تعظیم و تکریم کی، انھیں اپنے نوازشات سے سرفراز کیا، بالآخر وہ ماوراء النہر گئے، اور وہاں کے چھوٹے سے شہر سغد میں سکونت اختیار کرلی لیکن غالباً زمانے کے انقلاب سے کاہی کا باپ سغد سے کوفن نام کے ایک مقام پر منتقل ہوگیا جس کو تقی کاشی نے سغد ہی کی ایک ولایت بتلایا ہے، مگر تقی نے یہاں سغد کو سمرقند سے الگ نہیں کیا ہے، کیونکہ سغد کو اس وقت اتنی اہمیت حاصل نہیں تھی کہ اس کے ماتحت بہت سی ولایتیں ہوں، یہ اعزاز سمرقند کو حاصل ہے، قاسم کاہی کی پیدائش کوفن ہی میں ہوئی، خلاصۃ الاشعار کے دونوں نسخوں[۳] میں بغیر کسی اختلاف کے موجود ہے:

"سید مشارالیہ در کوفن کہ یکی از ولایت آنجاست متولد شدہ"۔

لیکن ڈاکٹر ہادی حسن نے اس کی جائے ولادت میاں کال لکھی ہے[۴]، ان کے قیاس کی بنیاد آئین اکبری[۵] کا یہ فقرہ ہے "قاسم کاہی عرف میان کالی"۔ جس میں لفظ "میاں کالی" میں "یائے نسبت" ہے یعنی میاں کال والا۔ ڈاکٹر موصوف کے نزدیک اس کے معنی یہ ہوئے، "قاسم کاہی جو میان کال والے کی نسبت سے پکارا جاتا تھا۔" اس توجیہ

---

۱؎ تاریخ مفصل ایران ص ۷۳۴ ۲؎ ورق ۲۲۲، ۴ ۱۳۳ ۳؎ قاسم کاہی، حالات و آثار ص ۵ ۴؎ ایضاً ص ۵ حاشیہ نمبر ۳ نیز ملاحظہ ہو آئین ص ۲۴۴



کی بنیاد بلوخمین کا وہ بیان ہے[۱] جس میں اس نے "میان کال" کو ایک جگہ کا نام بتایا ہے، اور اسکا جائے وقوع سمرقند اور بخارا کے درمیان (ایک پہاڑی مقام) لکھا ہے، مگر میرے نزدیک یہ توجیہ قرین قیاس نہیں، آئین اکبری میں عرف کا فقرہ کھٹکتا ہے، اگر یہ نہ ہوتا تو "کالی" میں "یائے نسبت" زیادہ قرین صحت ہوتی، دوسرے یہ کہ یہ عرف ہندوستان میں بہت عام ہے، یعنی اس "ی" کو معروف کے بجائے مجہول پڑھیے تو بات صاف ہوجاتی ہے، تیسرے یہ کہ منتخب التواریخ میں بدایونی نے[۲] قاسم کاہی کا عنوان قائم کرکے "میاں کالے" کے نام سے اس کا بیان شروع کیا ہے، اس سے صاف طور پر پتہ چلتا ہے کہ میاں کالے اس کا عرف تھا، اسلیے اس کو کسی مقام کی طرف منسوب کرنا صحیح نہیں ہو سکتا، چوتھے یہ کہ خلاصۃ الاشعار کا بیان نہایت واضح ہے۔ اس میں صراحۃً نہ صرف اس کا وطن دیا ہے، بلکہ اس کے اجداد کے ترک سکونت کرنے، سغد میں آباد ہونے اور وہاں سے دوبارہ منتقل ہوکر کوفن میں سکونت پذیر ہونے کا بھی بیان ہے، اس تذکرہ کو اپنی جگہ پر بڑی اہمیت حاصل ہے، اول یہ کہ اس کی تالیف کاہی سے پانچ برس بعد ہوئی، اور اسی سنہ کا لکھا ہوا نسخہ میرے سامنے ہے، دوسرے یہ کہ مدتوں اس کے مولف نے اس پر نظر ثانی کی، اور ۱۰۰۷ھ میں اس کا آخری اڈیشن تیار ہوا، اس اڈیشن کا بھی نسخہ میرے پیش نظر ہے، اس میں بھی قاسم کاہی کے اجداد کے متعلق وہی بیان ہے جو ۹۹۳ھ والے نسخے میں ہے، اور دونوں میں بغیر کسی اختلاف کے کاہی کی جائے پیدائش کوفن بتائی گئی ہے، ان چند در چند وجوہ کی بنا پر کاہی کا وطن اور مولد کوفن کے بجائے میاں کال قرار دینا صحیح نہیں ہو سکتا،

سید قاسم کاہی کی نشوونما کابل میں ہوئی، اور وہیں اس نے سارے علوم کی تحصیل کی،

---

۱؎ آئین ص ۲۴۴ ۲؎ منتخب التواریخ ج ۳ ص ۱۷۲،

خلاصۃ الاشعار[1] میں ہے :

درکابل نشو و نما یافتہ در ملازمت مولانا ولد مجذوب انواع فضائل حیازہ کردہ

ایں مطلع از جملہ نتائج طبع اوست ،

گل گل شگفتہ وست تو از داغ عاشقی      گلدستہ ایست آمدہ از باغ عاشقی

قاسم کاہی کے استاد کا نام وَلَد کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے، لیکن ایران میں اس طرح کے نام ملتے ہیں، مولانا روم کے صاحبزادے مولانا وَلَد کہلاتے تھے، ہمارے ہندوستان میں وَلَد تو نہیں البتہ ابّن جو ابن سے ماخوذ ہے، بہت عام ہے، مولانا ولد کے ساتھ مجذوب بھی شامل ہے جو بظاہر ان کا لقب تھا، مگر بالکل مجذوب ہونے کی حالت میں ان کی استادی مشتبہ ہو جائیگی، مختصر یہ کہ کابل میں مولانا وَلَد مجذوب کی شفقت استادی سے قاسم کاہی نے سارے فضائل حاصل کر لیے، معلوم ہوتا ہے مولانا وَلَد شعر و شاعری کا ذوق رکھتے تھے، صاحب خلاصہ نے ان کا ایک شعر نقل کر کے ان کے ذوق شعری کی طرف اشارہ کیا ہے، اور یہ بھی بتایا ہے کہ مولانا ہی کی توجہ سے کاہی نے میدان سخنوری میں قدم رکھا ہوگا، خلاصۃ الاشعار[2] کے دوسرے نسخے میں مولانا کے "تجرید و انقطاع" کا ذکر ہوا ہے، اس سے یہ قیاس کرنا صحیح ہوگا کہ قاسم کاہی کی تجرد پسندی مولانا ہی کے فیض صحبت کا نتیجہ تھی،

اس کے بعد خلاصۃ الاشعار[3] میں ورودِ ہند کا ذکر اس طرح پر ہوا ہے :

" اما میر قاسم بعد از تکمیل از ماوراء النہر بہند افتاد و در زمان ہمایوں پادشاہ درجۂ عالی یافت، چنانچہ مرجع خواص و عوام بود و سلاطین و اکابر معتقد او گردیدند و عرفا و اہل ذوق او را ملاذ و ملجا دانستند ؛

[1] ورق ۲۲۲، نسخہ دوم ورق ۱۳۳۴ [2] ورق ۱۳۳۴ [3] ورق ۲۲۲



اگرچہ ہمایوں نے پہلی دفعہ ۹۳۷ھ سے ۹۴۶ھ تک حکومت کی مگر اس وقت کاہی کی دربار ہمایونی سے وابستگی ثابت نہیں ہے، البتہ دوسری دفعہ ۹۶۲ھ میں جب اس کو حکومت ملی ہوگی، تو کاہی کو درجۂ عالی ملا ہوگا، چونکہ دوسرے ذریعہ سے معلوم ہے کہ ۹۶۱ھ میں شاہزادہ اکبر کے ساتھ قاسم آگرہ آیا تھا، اس لیے خلاصۃ الاشعار میں ورود ہند سے یہی سنہ مراد ہوگا، لیکن ورود ہند سے قبل کاہی کابل میں تھا، اس لیے کابل ہی سے آنا صحیح ہے، ماوراء النہر کا لفظ اس نسخہ میں غلط ہے، چنانچہ خلاصۃ الاشعار ہی کے دوسرے نسخہ[1] میں کابل ہی ہے،

مندرجۂ بالا عبارت میں "سلاطین" کا لفظ اشارہ کرتا ہے کہ قاسم کا تعلق کئی بادشاہوں سے رہا تھا، اگر اس عبارت کا تعلق صرف عہد ہمایونی سے سمجھا جائے تو اس کا یہ نتیجہ ہوگا کہ خود ہمایوں کے بعض معاصرین نے کاہی کے ساتھ اچھا سلوک کیا ہوگا، اور اگر کسی خاص عہد سے مخصوص نہ سمجھا جائے تو یہ تو معلوم ہی ہے کہ اکبر کے علاوہ اور دوسرے بادشاہوں نے اس کے ساتھ بڑا اچھا سلوک کیا تھا،

جیسا کہ اوپر اشارہ ہو چکا ہے کہ مولانا ولد مجذوب کی صحبت میں قاسم کاہی نے بڑے فضائل حاصل کیے، عرفان، تجرید، آزادمنشی، سخاوت وغیرہ کی صفات وہیں حاصل ہوئیں، خلاصہ[2] کے مندرجۂ بالا بیان سے اس کا کافی ثبوت ملتا ہے، مگر تفصیل ذیل کے بیان[3] سے ملتی ہے:

" یکی از ثقات کہ بصحبت وی رسیدہ بود چنیں گفت کہ بسی بفضلا و اکابر صحبت داشتم در مروت و سخاوت و درستی رای و ظرافت طبع مثل امیر قاسم کاہی ندیدیم و بکار دنیا کم التفات میشود و علی الدوام طالب صحبت درویشان میبود و انقطاع و تجردی بکمال داشت چنانچہ در مدت العمر ذخیرہ جہت خود نیندوخت و بفقر و قناعت روزگار گذرانید

[1] ورق ۱۳۳۴ [2] ورق ۲۲۲، [3] ورق ۱۳۳۴ (نسخہ دوم)

وخاطر شریف را بنیل آرزوی نفس نرنجانید"

یہاں ایک بات اور عرض کر دی جائے کہ مولف خلاصہ نے اسی تقریب سے تذکرہ کے توسط قاسم کاہی کے حالات بھی لکھے ہوں گے، اس لیے اس کا بیان اور بھی وقیع ہو جاتا ہے، کاہی کے کردار کے متعلق اوپر جو کچھ لکھا گیا ہے، کم و بیش سب اس کی تائید کرتے ہیں، لیکن اس کی سیرت کے کئی اہم پہلو ہیں، جن میں تجرید، سخاوت کو خاص اہمیت حاصل ہے، خلاصۃ الاشعار[1] میں اسکی سخاوت اور آزاد منشی کی دو بڑی مثالیں دی گئی ہیں،

(۱) شاہزادۂ اعظم سلطان جلال الدین اکبر اس پر نظر التفات رکھتا اور اس کی بڑی تربیت کرتا تھا، چنانچہ کاہی کی ملاقات کی کئی بار خواہش کی، اور چند مرتبہ سید کاہی کے مکان پر تشریف لیجاکر اس سے اپنی مجلس میں آنے کی استدعا کی، اور ایسا مقرر فرمایا کہ جس وقت سید مذکور دربار میں باریاب ہوں مبلغ ایک ہزار روپیہ جو بیس تومان کے برابر ہوتے ہیں، ان کو دیے جائیں، یہ سنکر سید قاسم کاہی مسکرایا، اور کہا گویا بادشاہ کو ملاقات کی خواہش نہیں، یہی وجہ ہے کہ فقیر کی حاضری اور ملاقات کے لیے اجرت کا تعین کرتے ہیں، اور احسان و انعام سے میری پشت گراں بار کرتے ہیں:

| | |
|---|---|
| دلم از ہمت عالی بوصال تو رسید | مرغ را گر نبود پر بہوائی نرسد |

ہفت اقلیم[2] میں بھی بعینہ یہی واقعہ مذکور ہے، مگر قاسم کی قیام گاہ پر بادشاہ کے تشریف لانے کا ذکر نہیں ہے، البتہ اتنا اضافہ ہے کہ اس کے بعد قاسم نے دربار میں آنا جانا بند کر دیا، مندرجہ بالا عبارت میں شاہزادۂ اعظم سے یہ گمان ہو سکتا ہے کہ یہ اس کی شاہزادگی کے زمانہ کا واقعہ ہوگا، لیکن "جلال الدین" کا لقب ظاہر کرتا ہے کہ وہ باقاعدہ تخت حکومت پر جلوہ افروز

[1] ورق ۲۲۲، ورق ۱۳۳۴ (نسخہ دوم) [2] ہادی حسن: کاہی و آثارش ص ۲۴



ہو چکا تھا،

(۲) گویند سخاوی او[1] بمرتبہ بود کہ وقتی سلطان جلال الدین اکبر صلۂ غزل لازم فیل دویست تومان فرستاد و او آن مبلغ کلی را در ہفتہ صرف شعرا و فقرا و مستحقان نمود.......

| | |
|---|---|
| ای آنکہ بنجل کیسہ را بند کنی | خود را بوجود مال خورسند کنی |
| این مال خدا است صرف کن در رہ او | امساک بمال دیگری چند کنی |

دو سو تومان دس ہزار روپیے کے برابر ہوتے ہیں، جیسا کہ صاحب خلاصہ کی تصریح سے ظاہر ہوتا ہے، چونکہ سرہندی[2] نے ایک روپیہ میں بیس تنکہ بتائے ہیں، اس حساب سے دس ہزار روپیے میں دو لاکھ تنکے ہوئے، مگر ہفت اقلیم[3] میں انعام کی رقم صرف ایک لاکھ تنکے بتائی گئی، جو ڈاکٹر ہادی کے یہاں ۵۰۰۰ روپیہ کے برابر بالکل ٹھیک قرار دیگئی ہے[4]، پس خلاصۃ الاشعار کی روایت کی صحت کی صورت میں یہ انعام اتنا ہی تھا جتنا کہ خواجہ حسین مروی کو عنایت ہوا تھا، لیکن مروی سے کاہی کا مرتبہ اس لیے بڑھ جاتا ہے کہ اس نے یہ سارا انعام فقیروں اور محتاجوں میں تقسیم کر دیا،

اس کے بعد خلاصہ کے صرف دوسرے نسخوں[5] میں فضیلت سخا کا بیان بڑی آب و تاب سے تقریباً دو صفحوں میں ہوا ہے، جو اس طرح شروع ہوتا ہے:

اکنوں محل آنست کہ چند کلمہ در فضیلت اسخیا... درین (جا) مسطور گردانم۔

خلاصۃ الاشعار کے دونوں[6] نسخوں میں اس کی شاعری و معرفت کا بیان ان الفاظ میں ہے:

باوجود این حالات در شاعری و سخنوری طبع لطیف دارد و مذاق او را جامی از خمخانۂ جاوید چشانیدہ اند بلکہ از دادی حال بسرحد دریافت اسرار اش رسانیدہ چنانچہ این

[1] ورق ۲۲۲ [2] ہادی حسن ص ۲۵ [3] ایضاً [4] ورق ۱۳۳۵ [5] ورق ۲۲۲ و ۱۳۳۶ الخ

قطعہ کہ از جملہ نتائج طبع وقاد او ست شاہد قوی و برہان متین ست برین معنی:

دوش کشیشی بدر سومنات | خواند یکی بیت ومن آموختم
حاصل عمرم دو سہ دم بیش نیست | خام بدم پختہ شدم سوختم

و ہیچ شک و شبہہ نیست کہ بی ترک دنیا ولذات آں رتبۂ عرفان و درجۂ کمال حاصل نشود، چہ محققین گفتہ اند بی رنج گنج میسر نگردد و بی تعب و زحمت نعمت و آسایش بدست نیاید، بہ پیشگاہ سعادت صاحب دولتی نزول تواں کرد کہ در مشاق جادۂ دنیا صبر بر لذات و مواجب آں تواند کرد و جمال کعبۂ عرفاں کہ اعظم مرادات است بر کسی تجلی کند کہ رنج بادیہ تعب ترک و تجرد را متحمل گردد الخ۔"

دیوان کاہی میں قطعہ کے پہلے مصرعے میں "ہندوی پیری" ہے کشیش بھی اس معنی میں مستعمل ہے، اس لیے اس سے زیادہ فرق واقع نہیں ہوتا، بلکہ چونکہ وہ مذہبی پیشوا ہوتا ہے اس لیے، لفظ قابل ترجیح ہے، غیاث اللغات میں اس لفظ کے یہ معنی دیے ہیں:

"لفظ ترکی ست، پیشوا و معلم ترسایان و زاہد نصرانیاں و بت پرستاں" [ص ۴۰۳]

آموختم سے صاف ظاہر ہے کہ کاہی خود اس کے شعر کا مفہوم نہیں سمجھ سکا تھا، اس لیے اس نے اس کا مطلب دریافت کیا ہوگا، اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ سومنات میں وہ کچھ دنوں رہا ہوگا، اور وہاں کے مندر کے پاس آمد و رفت بھی رکھتا ہوگا، "در سومنات" سے قیاس ہو سکتا ہے کہ وہ سومنات کے مندر میں بھی گیا ہوگا، دوسری بیت کو کاہی نے اپنے طور پر اس طرح کر دیا کہ وہ مولانا روم[1] کا شعر ہو گیا، جو یا تو اس طرح ہے:

حاصل عمرم سہ سخن بیش نیست | خام بدم پختہ شدم سوختم

[1] ملاحظہ ہو ہادی حسن ص ۶-۷



جیسا کہ دیوان کاہی میں ہے اور مولانا شبلی نعمانی نے نقل کیا ہے، دیوان مولانا روم میں یوں آیا ہے:

حاصل ازیں این سہ سخن بیش نیست | خام بدم پختہ شدم سوختم

مگر خلاصۃ الاشعار میں کسی قدر فرق کے ساتھ نقل ہوا ہے،

قاسم کاہی کی وفات کے بارے میں خلاصۃ الاشعار میں[1] یہ اطلاع ملتی ہے،

اما وفات سید قاسم در شہر آگرہ اتفاق افتاد فی شہور سنہ ۹۸۸ بعد از انکہ سال عمرش بصد و دہ سال رسیدہ بود و در آن جا مدفون است

نسخہ دوم میں[2] اتنا اور اضافہ ہے:

و خواجہ محمد قاسم مستوفی تاریخ وی را چنین گفتہ:

کاہی چو بداو جان شیریں در تب | برخاست ز اہل ہوش یارب یارب
چوں شہرۂ آفاق بخوش طبعی بو | تاریخ وفات او ز "خوش طبع" طلب

یہ بیان بالکل ہفت اقلیم کے مشابہ ہے، مقام وفات، مدفن اور عمر سب یکساں ہے؛ قطعۂ تاریخ بھی دونوں میں ایک ہے، لیکن قطعہ نظم کرنے والے کے نام میں اختلاف ہے، ہفت اقلیم میں[3] اس کا نام محمد یوسف استرآبادی ہے، اور یہاں خواجہ محمد قاسم مستوفی ہے، چونکہ خلاصۃ الاشعار کے قدیم نسخے میں جو ہفت اقلیم سے نو سال مقدم ہے، اور اس کا خطی نسخہ، اس شاعر کے تمام ماخذوں کے خطی نسخوں سے قدیم تر ہے، یہ تاریخ نہیں ملتی، اسلیے خلاصۃ الاشعار کے دوسرے نسخے کی بنا پر ہفت اقلیم کے قول کی تردید نہیں ہو سکتی، جبکہ یہ بھی معلوم ہے کہ صاحب ہفت اقلیم ہندوستان آیا ہے اور خلاصۃ الاشعار کا مولف ہندوستان نہیں آسکا ہے لیکن یہ بات بہر حال قابل حیرت

[1] ورق ۲۲۳ [2] ورق ۱۳۳۷ [3] ہادی حسن: ص ۳۵

ضرور ہے کہ "خوش طبع" سے سنہ ۹۸۶ھ نکلتا ہے، حالانکہ اس کی وفات ۹۸۸ھ ہے۔

ڈاکٹر ہادی حسن صاحب نے قاسم کاہی کے حسب ذیل شعر سے یہ استدلال کیا ہے[1] کہ اس نے تمام عمر شادی نہیں کی:

عروس دہر کاہی را نہ بیند    از اں رو ہمچو عیسیٰ گشتہ مردم

اور یہ استدلال قرین قیاس معلوم ہوتا ہے، مگر سفینۂ ہندی میں مرزا فاخر مکین کے حالات میں لکھا ہے کہ اس کا سلسلۂ نسب چند واسطوں سے قاسم کاہی تک پہنچتا ہے، چونکہ اس تذکرہ کا مولف رائے بھگوان داس ہندی مرزا فاخر مکیں کا شاگرد ہے، اور اس نے مرزا ہی کی حیات میں ۱۲۱۹ھ میں یہ تذکرہ مکمل کیا ہے، اس سے اس کے بیان کی اہمیت زیادہ ہو جاتی ہے، مگر ایک قباحت یہ ضرور ہے کہ خود سفینۂ ہندی میں ہے کہ مرزا کے جد اعلیٰ علی مردان خان کے ساتھ ایران سے ہندوستان آئے اور دہلی میں مقیم ہو گئے، حالانکہ ہم کو بطور حتم و یقین معلوم ہے کہ قاسم کاہی ہندوستان ہی میں مرا، اسلیے اگر اس کی اولاد ہوگی تو اسکا ہندوستان ہی میں سکونت پذیر ہونا زیادہ قرین قیاس ہوگا، اسلیے جد اعلیٰ کے ہندوستان آنے کا سوال ہی نہیں، مگر اس فیصلہ کو قطعی نہیں قرار دیا جاسکتا، کیونکہ امکان اسکا باقی رہ جاتا ہے کہ قاسم کاہی کی اولاد میں کوئی ہندوستان سے ایران چلا گیا ہو، لیکن یہ احتمال بہت ضعیف ہے، اسی طرح مدت العمر شادی نہ کرنے کا فیصلہ بھی قطعی نہیں قرار دیا جا سکتا، یہ ضرور ہے کہ جس وقت یہ شعر کہا گیا ہے اس وقت تک اسکی شادی نہیں ہوئی تھی، ممکن ہے اس نے اپنی عمر کی ابتدائی یا درمیانی زندگی میں یہ بیت کہی ہو، جو شخص ۱۱۰ یا ۱۲۰ سال کی طویل عمر پائے اس کے نزدیک بڑی عمر میں شادی کرنا بعید از قیاس نہ ہوگا، بہرحال اس ضعیف احتمال کے بعد بھی ڈاکٹر ہادی حسن کا استدلال زیادہ قابل قبول ہے۔

(باقی)

---

[1] ہادی حسن: ص ۵



# تفسیر کبیر اور اس کے تکملہ کے متعلق

مترجمہ مولوی ضیاء الدین صاحب اصلاحی رفیق دارالمصنفین

ذیل کا مضمون الاستاذ عبد الرحمن المعلمی کے ایک مضمون "حول تفسیر الفخر الرازی" کا ترجمہ ہے، جو مجلہ الحج مکہ کی تین قسطوں میں شائع ہوا تھا، مضمون نگار نے پوری تحقیق و کاوش کے بعد امام رازی کی اصل تفسیر اور اس کے تکملہ کو ایک دوسرے سے الگ کیا ہے، اور چونکہ یہ ایک نہایت علمی اور تحقیقی بحث تھی اس لیے اس کا ترجمہ ہدیۂ ناظرین کیا جا رہا ہے۔

(ض)

علامہ شیخ محمد بن عبد العزیز نے مجھے بتایا کہ صاحب کشف الظنون نے لکھا ہے:

"امام فخر الدین رازی کی تفسیر مفاتیح الغیب ناتمام اور تشنہ تھی، اسے نجم الدین احمد بن محمد قمولی نے پایۂ تکمیل کو پہنچایا۔" چنانچہ طبقات ابن سبکی اور درر کامنہ میں بھی نجم الدین قمولی کے حالات میں اس کا ذکر ملتا ہے کہ انھوں نے تفسیر کبیر کو مکمل کیا ہے۔

شیخ نے اس بات کا تذکرہ کر کے گویا مجھے اس مسئلہ کی تحقیق و تدقیق کی دعوت دی، کیونکہ آج امام رازی کی مکمل تفسیر چھپی ہوئی موجود ہے، اور عام طور سے پوری کی پوری انہی کی طرف منسوب کیجاتی ہے، اور کسی کو اس کی خبر نہیں کہ امام صاحب کی اصل تفسیر کہاں تک ہے، یا کون حصے خود ان کے لکھے ہوئے ہیں اور کون دوسروں کے ہیں، اور اس خفا کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ تفسیر کا اول و آخر حصہ ایک ہی نہج اور ڈھنگ پر ہے،

لیکن ابھی تک مجھے باقاعدہ تفسیر کبیر کے مطالعہ کی نوبت نہیں آئی تھی، اور سردست اس کے مطالعہ کے لیے کچھ موانع بھی تھے، اس لیے میں نے سوچا کہ اگر میں تراجم و تواریخ اور فہرستوں کو دیکھ لوں تو تفسیر کے مطالعہ کی زحمت سے بچ جاؤں گا، اور اس مسئلہ کی تحقیق بھی ہو جائیگی،

لیکن مجھے افسوس ہے کہ ان کتابوں کے دیکھنے کے بعد بھی مجھے کوئی ایسی تحقیق دستیاب نہیں ہو سکی جس سے یہ معلوم ہو کہ امام کی اصل تفسیر کہاں تک ہے، البتہ بعض جدید فہرستوں میں سید مرتضیٰ زبیدی کے قلم سے شفا خفاجی کی شرح کے حوالے سے اتنی بات معلوم ہوئی کہ امام رازیؒ سورۂ انبیاء تک تفسیر لکھ سکے تھے، اس لیے مجھے شوق ہوا کہ خفاجی کی عبارت اور اس کی شرح شفا، جو چار ضخیم جلدوں میں شائع ہوئی ہے، دیکھوں

چنانچہ سب سے پہلے میں نے چاروں جلدوں کی فہرستوں پر ایک نظر ڈالی اور جہاں جہاں بھی مذکورۂ بالا عبارت کا احتمال ہو سکتا تھا، وہاں کتاب کھول کر دیکھا، مگر وہ عبارت نہ مل سکی، اس لیے مجبوراً میں نے اس شرح کو شروع سے پڑھنے کی زحمت کی، مگر مجھے زیادہ زحمت نہیں اٹھانی پڑی، کیونکہ پہلی جلد (مطبوعہ قسطنطنیہ ۱۲۶۷ھ) کے صفحہ ۲۶۷ پر وہ عبارت مل گئی مگر اس عبارت کا یہ فقرہ:

"الثابت فی کتب المورخین (سورۂ انبیاء تک امام کی تفسیر کا ہونا مورخین کی کتابوں میں ثابت ہے")

میرے لیے سخت حیرت اور شبہہ کا باعث بنا، کیونکہ میں نے مورخین کی کتابوں کا اس بارے میں تتبع کر لیا تھا، اور مجھے کہیں بھی یہ تحدید نظر نہیں آئی،

اگر یہ اتنی ہی ظاہر اور ثابت چیز تھی تو بعض کو تو کم از کم اس کی نشاندہی کرنا چاہیے تھا اور صاحب کشف الظنون سے یہ چیز کیسے مخفی رہی جبکہ ان کی وسیع النظری مسلّم ہے، اور خود زبیدی سے بھی یہ مسئلہ کیسے مخفی رہا کہ اس کو خفاجی کی کتاب کے حوالے سے نقل کرنے کی ضرورت ہوئی، اور پھر



اس کے بعد تمام لوگوں پر کیونکہ یہ ثابت شدہ چیز واضح ہوئی، یہانتک کہ انھیں صرف زبیدی کے قلم سے خفاجی کی کتاب کے حوالے سے یہ بات معلوم ہوئی ہے،

اس لیے اب براہ راست تفسیر کا مطالعہ کرنا ناگزیر ہوگیا، چنانچہ میں نے سورہ انبیاء اور اس کے ماقبل وما بعد کی سورتوں کی تفسیر اٹھا کر دیکھنا شروع کیا، تو خفاجی کے قول میں اور زیادہ شک و شبہہ پیدا ہوا، کیونکہ مجھے پوری کتاب میں ایک ہی طرز نگارش اور اسلوب کلام نظر آرہا تھا، اس لیے میں نے یہ قطعی رائے قائم کر لی کہ سورہ انبیاء اور اس کے بعد کی سورتوں کی تفسیر کا مفسر وہی شخص ہو سکتا ہے جس نے سورہ کہف، مریم اور طٰہٰ کی تفسیریں لکھی ہیں، اس کے بعد جب میں نے سورۂ بقرہ، آل عمران کی تفسیروں کے بعض مقامات دیکھے اور اسی کے ساتھ تفسیر کے اختتام کو بھی دقتِ نظر سے دیکھنا شروع کیا، تو ان سب کو ایک ہی رنگ میں رنگا ہوا پایا، اور ان تمام سورتوں کی تفسیروں کا طرز تحریر سورۂ انبیاء کی تفسیر کے انداز تحریر کے بالکل مجھے مطابق ملا،

لیکن جب سورۂ اخلاص کی تفسیر میں یہ الفاظ ملے کہ

| | |
|---|---|
| وقد استقصینا فی تقریر دلائل | اور لو کان فیہما آلہۃ الخ کی تفسیر میں ہم نے |
| الوحدانیۃ فی تفسیر قولہ: لو کان | وحدانیت کے دلائل کی پوری تقریر |
| فیہما آلہۃ الا اللہ لفسدتا | کی ہے، |

تو میں سمجھا کہ چونکہ یہ سورۂ انبیاء کی آیت ہے اس لیے یہیں سے کہنے والے کو یہ خیال ہوا ہوگا کہ امام رازیؒ سورۂ انبیاء کی تفسیر تک پہنچے تھے اور اسی فقرہ سے اس نے یہ رائے قائم کی ہوگی، کیونکہ یہ بات تو بہرحال تاریخی طور پر واضح تھی کہ امام نے تفسیر کو نا تمام چھوڑا تھا، اور دوسروں نے اسے مکمل کیا ہے، اور تفسیر نویسی کا عام قاعدہ یہ ہے کہ مفسر ابتداءً قرآن سے تفسیر کا آغاز کرتا ہے، اور پھر اسی ترتیب سے لکھتا چلا جاتا ہے، اور بظاہر امام رازیؒ نے بھی ایسا ہی کیا ہوگا،

اس لیے جب انھوں نے اپنی تفسیر خود مکمل نہیں کی ہے، جیسا کہ مورخین قطعی طور سے کہتے ہیں تو ضرور کوئی ایسا مقام ہوگا، جہاں تک امام صاحب خود پہنچے ہوں گے، اور اس کے بعد سے دوسروں نے تکملہ کیا ہوگا، اور چونکہ مورخین کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ امام رازیؒ نے تفسیر کا اچھا خاصہ حصہ ناتمام چھوڑا تھا، اور سورۂ اخلاص تو یقیناً تکملہ میں شامل ہوگی، اس لیے یہ لفظ "قد استقصینا" مکمل کرنے والا کا بیان ہو، اسلیے محولۂ بالا آیت کی تفسیر بھی مکمل کرنے والے ہی نے لکھی ہوگی۔

بہرحال ان معارضات اور مناقشات کو نظرانداز کیجئے، میں کہہ رہا تھا کہ خفاجی کے قول میں میرا شک و شبہہ بڑھتا اور محکم ہوتا گیا، بلکہ اس کے قول کا بطلان بھی مجھ پر واضح ہوگیا، جیسا کہ آگے چل کر بیان کیا جائے گا، بار بار میں نے حج، مومنون، نور، فرقان، شعراء اور قصص کی تفسیروں کو غور و خوض اور نہایت ہی رک رک کر اور سمجھ سمجھ کر پڑھا، لیکن مجھے کوئی ایسا اسلوب تحریر نہیں دکھائی دیا جو میرے لیے پہلے کے مقابلہ میں نیا اور نامانوس ہو اسکے ساتھ مجھے ایسے شواہد اور دلائل بھی کثرت سے ملتے گئے جن سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ یہ امام رازیؒ ہی کا کلام ہے، لیکن سورہ عنکبوت کو شروع کرتے ہی صاف طریقہ سے محسوس ہونے لگا کہ یہاں دوسری روح جھلک رہی ہے، اور دوسرا اسلوب بیان ہے، جس میں پہلے اسلوب کے نقل کرنے کی کوشش کی گئی ہے، مگر اس کے بعد بھی وہ طرز اور اسلوب اس میں نہیں پیدا ہوسکا ہے، اور جب میں نے ذرا دقت نظر سے کام لیا، تو مجھے اور چند در چند ایسی چیزیں ملیں جو اس کو پہلی سورتوں کی تفسیروں سے جدا کر رہی تھیں، اور بتا رہی تھیں کہ ان دونوں میں بڑا فرق ہے، پھر میں نے سورۂ روم، لقمان اور سجدہ کی تفسیروں کو بھی پڑھکر جانچا تو یہی دوسرا طریقۂ کلام جاری و ساری ملا۔



اس وقت میں نے سمجھا کہ حقیقت تک میری رسائی ہوگئی، اور صحیح یہ ہے کہ امام رازیؒ نے سورۂ قصص تک خود تفسیر لکھی ہے، اس کے بعد سے تکملہ شروع ہوتا ہے، پھر بھی میں نے اپنی کاوش جاری رکھی، اور اس کے آگے ایک ایک سورہ کے شروع کی تفسیریں دیکھتا جاتا تھا، جب سورۂ صافات کی تفسیر پڑھنا شروع کیا تو پھر وہی پہلا اسلوب تحریر نظر آیا، جب اور آگے بڑھا تو پانچ چھ سورتوں تک یہی طرز تحریر دکھائی دیتا رہا، مگر پھر اس سے آگے دوسرا اسلوب نگارش عود کر آیا، اس طرح کبھی پہلا طریقۂ بیان و انداز کلام ملتا رہا اور کبھی دوسرا، اس لیے میں نے فیصلہ کیا کہ اب پورے غور و فکر کے ساتھ ایک ترتیب سے اسکا مطالعہ اور اس مسئلہ کی تحقیق کرنا چاہیے، چنانچہ اس تحقیق و تفتیش کے بعد میں جن نتائج تک پہنچ سکا ہوں، انھیں اول سے آخر تک ترتیب کے ساتھ، دلائل اور شواہد کی روشنی میں سوال و جواب کی شکل میں اختصار کے ساتھ پیش کرتا ہوں،

## امام رازی نے مکمل تفسیر لکھی ہے یا نہیں؟

اس سوال کا جواب مندرجۂ ذیل اقتباسات سے خود ہی واضح ہو جائیگا۔

ابن ابی اصیبعہ نے عیون الانبا، میں امام رازیؒ کے حالات میں ان کی تصنیفات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

| | |
|---|---|
| کتاب التفسیر الکبیر المسمی مفاتیح الغیب. اثنتا عشرۃ مجلدۃ بخط الدقیق[1] | تفسیر کبیر کا اصل نام مفاتیح الغیب ہے، یہ باریک خط میں بارہ جلدوں میں ہے۔ |

اس عبارت سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ امام صاحب نے تفسیر مکمل لکھی ہے، مگر اسی کتاب

[1] عیون الانبا ج ۲ ص ۲۹

میں ابن ابی اصیبعہ نے آگے چل کر شمس الدین احمد بن خلیل الخوئی کے ذکر میں لکھا ہے:

ان له تتمة تفسير القرآن لابن خطيب الري[۱]

ابن خطیب رے کی تفسیر قرآن کے ناتمام حصہ کو اس نے مکمل کیا

ابن خطیب الری سے امام رازی مراد ہیں،

ابن ابی اصیبعہ نے خوئی ہی کے تذکرہ میں اپنے متعلق لکھا ہے کہ انھوں نے خوئی سے استفادہ کیا ہے، اور پھر خوئی کی امام رازی سے ملاقات و استفادہ کا بھی ذکر کیا ہے، امام رازی کا سال وفات ۶۰۶ھ اور خوئی کا انتقال ۶۳۷ھ میں ہوا،

علامہ ابن خلکان امام فخر الدین رازی کی تصنیفات کے سلسلہ میں تحریر فرماتے ہیں:

منها تفسير القرآن الكريم جمع فيه كل غريب وغريبة وهو كبير جدا لكنه لم يكمله وشرح سورة الفاتحة في مجلد[۲]

انکی تصنیفات میں قرآن کی تفسیر بھی ہے اور اس تفسیر میں ہر عجیب و غریب چیز جمع کی ہے، اور یہ بہت ضخیم ہے لیکن امام نے اسے مکمل نہیں کیا تھا اور انھوں نے سورۂ فاتحہ کی تفسیر ایک الگ جلد میں لکھی ہے،

ابن سبکی المتوفی ۷۷۱ھ نے طبقات میں جس جگہ امام رازی اور ان کی تصنیفات کا ذکر کیا ہے وہاں تو اس طرح کی کوئی بات نہیں لکھی ہے، مگر نجم الدین القمولی کے حالات میں لکھا ہے:

وله تكملة على تفسير الامام فخر الدين[۳]

اور اس نے امام فخر کی تفسیر کو مکمل کیا،

شذرات الذہب میں قمولی کے ذکر میں اسنوی المتوفی ۷۷۲ھ کا قول ہے:

وكمل تفسير ابن الخطيب[۴]

انھوں نے ابن خطیب کی تفسیر کو مکمل کیا،

اور خود امام رازی کے حالات میں لکھا ہے:

---

۱؎ عیون الانباء ج ۲ ص ۱۷۱، ۲؎ تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۴۷۴، ۳؎ طبقات ابن سبکی ج ۵ ص ۳۵ ۴؎ شذرات الذہب ج ۶ ص ۵



قال ابن قاضي شهبة ومن تصانيفه تفسير كبير لم يتمه في اثني عشر مجلدا كبارا[۱]

ابن قاضی شہبہ کا بیان ہے کہ امام رازی کی تصنیفات میں ایک بارہ جلدوں پر مشتمل ضخیم تفسیر ہے جسے انھوں نے نامکمل چھوڑا تھا،

ابن قاضی شہبہ کا انتقال ۸۵۱ھ میں ہوا ہے،

علامہ ابن حجر متوفی ۸۵۲ھ نجم الدین القمولی کے حالات میں ارقام فرماتے ہیں:

واكمل تفسير الامام فخر الدين[۲]

امام فخر الدین کی تفسیر کو پورا کیا،

## تفسیر کبیر کو کس نے مکمل کیا؟

یہ دوسرا سوال ہے جس کا جواب بھی گذشتہ تصریحات میں دیا جا چکا ہے کہ خوئی اور قمولی ہر ایک نے اسے مکمل کیا ہے[۳]،

**خوئی** | اس کا صحیح نام و لقب اور نسبت اور سنہ وفات یہ ہے:

شمس الدين قاضي القضاة احمد بن خليل الخوئي المتوفى ۶۳۷ھ

لیکن بعض تذکرہ نویسوں نے اس کے نام اور اس کے بیٹے شہاب الدین قاضی القضاۃ محمد بن احمد بن خلیل الخوئی کے نام میں خلط ملط کر دیا ہے، مگر صحیح نام معتبر کتابوں کے حوالے وہی معلوم ہوتا ہے، جسے ہم نے اوپر درج کیا ہے،

**قمولی** | اس کا پورا نام و لقب یہ ہے: نجم الدین احمد بن محمد القمولی، اور سال وفات طبقات ابن السبکی، الدرر الکامنہ، شذرات اور کشف الظنون وغیرہ میں ۷۲۷ھ درج ہے، لیکن کشف الظنون کے کسی نسخہ کے حوالے سے ازہر اور تیموری کتبخانوں کی فہرستوں میں اس کا سال وفات ۷۷۷ھ درج ہے، مگر یہ غلط ہے، اور صحیح وہی ہے جسے ہم نے پہلے ذکر کیا ہے،

---

۱؎ شذرات الذہب ج ۵ ص ۲۱ ۲؎ الدرر الکامنہ ج ۱ ص ۲۰۴ ۳؎ مضمون نگار نے یہاں دونوں کو مکمل کرنے والا بتایا ہے حالانکہ بعد میں ابن خلکان کا خیال یہی معلوم ہوتا ہے کہ صرف خوئی نے اسے مکمل کیا تھا، (مترجم)

بعض لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ علامہ سیوطی نے امام رازی کی تفسیر کا تکملہ لکھا ہے، جو سورہ سبّح (غالباً سورۂ حشر مراد ہے) سے آخر قرآن تک ایک جلد میں ہے، لیکن صاحب کشف الظنون نے لکھا ہے کہ سیوطی کی بھی خود ایک تفسیر ہے، جس کا نام مفاتیح الغیب ہے اور انھوں نے اسے اسی قدر لکھا ہی تھا، اور بظاہر یہی بات معلوم ہوتی ہے، کہ یہ کوئی مستقل تفسیر تھی نہ کہ تکملہ،

اب جبکہ پوری تفصیل کے ساتھ یہ بتایا جاچکا ہے کہ امام رازی نے تفسیر کبیر کو ناتمام چھوڑا تھا تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان کی اصل تفسیر کہاں تک ہے، یا کون کون سے حصے خود ان کے قلم کے لکھے ہوئے ہیں، اور کہاں سے تکملہ شروع ہوتا ہے، یا تفسیر میں کن کن مقامات میں یہ تکملے درج ہیں،

**امام رازی کی اصل تفسیر اور اس کے تکملہ کی تعیین**

یہ دوسرا سوال ہے، اس کا جواب ذرا طویل اور تفصیل طلب ہے، قاضی عیاض کی شفا کی شرح میں شہاب خفاجی المتوفی ١٠٦٩ھ نے لکھا ہے کہ

| | |
|---|---|
| الثابت فی کتب التاریخ ان التفسیر | تاریخ کی کتابوں سے یہ بالکل ثابت ہے کہ تفسیر |
| الکبیر وصل الی سورۃ الانبیاء | کبیر سورہ انبیاء تک ہوئی تھی، اور اس کے بعد |
| وکملہ تلمیذہ الخوئی | امام کے شاگرد خوئی نے مکمل کیا ہے، |

لیکن اس قول کے متعلق ہمارا شک و شبہہ اوپر گذر چکا ہے، اور ہم نے وہیں تفسیر میں اپنے غور و فکر کا بھی تذکرہ کیا تھا، اس غور و فکر اور تحقیق و کاوش کے بعد جو کچھ ہمارے ہاتھ لگا ہے اسے اجمال کے ساتھ لکھا جاتا ہے،

ہمارے پیش نظر تفسیر کبیر کے دو نسخے ہیں اور ان ہی کے مطابق آیندہ حوالے ہوں گے، پہلا نسخہ ١٢٧٨ھ میں مصر سے چھ جلدوں میں شائع ہوا ہے، اور دوسرا وہ قلمی نسخہ ہے جو حرم کی کے کتبہ میں محفوظ ہے،

۱۔ اس نسخہ مخطوطہ میں سورہ بقرہ کی تفسیر کے آخر میں مصنف تاریخ کا ان الفاظ میں ذکر کرتے ہیں



"وقد تم یوم الخمیس فی المعسکر المناخم للقریۃ المسماۃ بار (صف)
سنۃ اربع وتسعین وخمسمائۃ"

اسی نسخہ میں آل عمران کی تفسیر کے آخر میں یوں درج ہے

"وقال رضی اللہ عنہ: تم تفسیر ہذہ السورۃ یوم الخمیس"

اسی طرح مطبوعہ نسخہ میں بھی ہے، مگر اس اضافہ کے ساتھ

"اول ربیع الآخر سنۃ خمس وتسعین وخمسمائۃ"

ایسے ہی اگلی بیشتر سورتوں کے آخر میں تاریخ کا ذکر ملتا ہے، یہاں تک کہ سورہ کہف کے آخر میں دونوں نسخوں میں یہ عبارت ملتی ہے،

| | |
|---|---|
| تم تفسیر ہذہ السورۃ یوم | اس سورہ کی تفسیر بروز منگل ۱۷ صفر |
| الثلثاء السابع عشر من صفر | ٦٠٢ھ بمقام غزنین ختم ہوئی |
| سنۃ اثنتین وستمائۃ فی بلدۃ غزنین | |

لیکن یہاں سے یہ سلسلہ سورہ یٰس کی تفسیر تک منقطع ہو جاتا ہے، اور سورہ صافات کی تفسیر کے آخر میں نسخہ مطبوعہ کے مطابق پھر تاریخ کا ذکر ملتا ہے،

| | |
|---|---|
| تم تفسیر ہذہ السورۃ ضحوۃ | اس کی تفسیر جمعہ کے دن چاشت کے |
| یوم الجمعۃ السابع عشر من | وقت ۱۷ ذو قعدہ ٦٠٣ھ کو مکمل |
| ذی القعدہ سنۃ ثلاث وستمائۃ | ہوئی، |

اسی طرح یہاں سے سورہ احقاف کے آخر تک تاریخ اختتام درج ہوتی چلی گئی ہے، جیسا کہ دونوں نسخوں میں احقاف کے آخر میں ہے:

| | |
|---|---|
| تم تفسیر ہذہ السورۃ یوم | اس سورہ کی تفسیر چہار شنبہ کو |

الاربعاء العشرین من ذی الحجۃ سنۃ ثلاث وستمائۃ — ۲۰ ذی الحجہ ۶۰۳ھ میں تمام ہوئی

.........

سورۂ قتال کے آخر میں تاریخ کا کوئی ذکر نہیں، البتہ سورۂ فتح کی تفسیر کے آخر میں مطبوعہ نسخوں میں حسب ذیل تحریر ملتی ہے:

تم تفسیر ھذہ السورۃ یوم الخمیس السابع عشر من شھر ذی الحجۃ سنۃ ثلاث وستمائۃ — اس سورہ کی تفسیر پنجشنبہ ۱۷ ذی الحجہ ۶۰۳ھ کو پوری ہوئی،

مگر یہ تاریخ غلط درج معلوم ہوتی ہے، کیونکہ اس سال پہلی ذی الحجہ کو جمعہ کا دن تھا جیسا کہ سابقہ تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے، نیز بعض کتابوں میں بھی ایسے قرائن درج ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سال یکم ذی الحجہ کو جمعہ کا دن تھا، اس لیے پنجشنبہ کو ۱۷ تاریخ کا ہونا قرین قیاس نہیں معلوم ہوتا ہے،

۲۔ شہاب خفاجی نے جس کو تکملہ خیال کیا ہے، اس میں بیشتر مواقع پر ایسے واضح دلائل اور صریح اشارات ملتے ہیں، جن سے پتہ چلتا ہے کہ یہ امام رازیؒ ہی کی تصنیف ہے، مثلاً سورۂ انبیاء کی تفسیر میں ہے:

اما الماخذ الاول فقد تکلمنا فیہ فی الجملۃ فی کتابنا المسمی بالمحصول فی الاصول[1] — رہا پہلا ماخذ تو اس کے بارہ میں ہم نے اپنی کتاب "محصول فی الاصول" میں گفتگو کی ہے،

اسی طرح سورۂ زمر کی تفسیر میں لکھا ہے:

---

[1] تفسیر کبیر جلد ۴ ص ۵۲۱



الثالث کان الشیخ الوالد ضیاء الدین عمر رحمہ اللہ یقول[1] — تیسرے ہمارے والد اور استاد ضیاء الدین عمر رحمہ اللہ کہتے تھے،

اسی سورہ کی تفسیر میں ہے:

لنا کتاب مفرد فی تنزیہ اللہ تعالیٰ سمیناہ بتاسیس التقدیس[2] — خدا کی تنزیہ کے متعلق ہماری ایک الگ کتاب ہے جس کا نام تاسیس التقدیس ہے

سورۂ حشر کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

اعلم انا قد تمسکنا بھذہ الآیۃ فی کتاب المحصول فی اصول الفقہ[3] — یہ واضح رہے کہ ہم نے اس آیت کو اصول فقہ کی کتاب کتاب المحصول میں اختیار کیا ہے

ایسے ہی سورۂ مدثر کی تفسیر میں تحریر فرماتے ہیں:

والاستقصاء فیہ قد ذکرناہ فی المحصول من اصول الفقہ[4] — اور اس کے بارے میں ہم نے استقصا محصول میں کیا ہے،

اور سورۂ فجر کی تفسیر میں بھی لکھتے ہیں،

وجواب المعارضۃ بالنفس مذکور فی کتابنا المسمی بلباب الاشارات[5] — نفس معارضہ کا جواب ہماری کتاب لباب الاشارات میں ہے،

کتاب المحصول اصول فقہ کی اور تاسیس التقدیس عقائد کی کتاب ہے، لباب الاشارات ابن سینا کے اشارات کا خلاصہ ہے، اور یہ تینوں امام فخر الدین رازیؒ کی نہایت مشہور و معروف تصنیف ہیں، ایسے ہی ضیاء الدین عمر امام رازی کے پدر بزرگوار اور انکے شیخ و استاد ہیں،

ان واضح اشارات کے ساتھ بعض اور چیزیں بھی ملتی ہیں، مثلاً سورۂ فرقان میں ہے:

---

[1] تفسیر کبیر جلد ۵ ص ۵۱۴ [2] ایضاً ج ۵ ص ۸۴۴ [3] ایضاً ج ۶ ص ۵۰۷ [4] ایضاً ص ۴۰۴ [5] ایضاً ص ۵۴۸

فی تحقیقه وبسطه کلام دقیق — اور اسکی تحقیق وبسط میں نہایت دقیق گفتگو ہے

یرجع فیه الی کتبنا العقلیة [1] — جس کے لیے ہماری کتب معقولات کو دیکھنا چاہیے ،

سورۂ قصص میں لکھتے ہیں :

وهذه طریقة رکیکة بینا سقوطها — اور یہ نہایت رکیک طریقہ ہے جس کی خامی

فی الکتب الکلامیة [2] — ہم نے کلام کی کتابوں میں واضح کی ہے

سورۂ فصلت کی تفسیر میں ہے :

لانا قد دللنا فی المعقولات [3] — کیونکہ ہم نے کتب عقلیہ میں اسے واضح کیا ہے

سورۂ قیامہ کی تفسیر میں لکھا ہے :

بینا فی الکتب العقلیة ضعف تلك [4] — ہم نے کتب عقلیہ میں اسکی کمزوری بیان کردی ہے

الوجوه فلا حاجة ههنا الی ذکرها — اس لیے یہاں اس کے ذکر کی ضرورت نہیں ،

ان صریح بیانات کے بعد غور کرنا چاہیے کہ جن حضرات کی طرف تکملے کی نسبتیں کیگئی ہیں ، ان کی بھی معقولات یا علم کلام میں کوئی کتاب ہے ، جس کا انھوں نے حوالہ دیا ہے ۔ اس لیے لامحالہ یہی کہنا پڑتا ہے کہ یہ امام رازی کی تصنیف کے اجزا ہیں ، البتہ سورۂ یٰس کی تفسیر میں جو یہ عبارت درج ہے کہ

قد ذکرنا الدلائل الدالة علی جواز الخلاء فی الکتب العقلیة [5]

دراصل صحیح نہیں بلکہ نسخۂ مخطوطہ کی عبارت صحیح ہے ، جو یہ ہے : قد ذکر الدلائل الخ

اب اس کے بعد ان اقتباسات کو بھی دیکھیے :

سورۂ نور کی تفسیر میں ہے :

فقد بینا فی اصول الفقه [6] — ہم نے اصول فقہ میں بیان کیا ہے

[1] تفسیر کبیر ج ۵ ص ۸۰ ، [2] ایضاً ص ۵۳۰ ، [3] ایضاً ص ۶۱۲ ، [4] ایضاً ج ۶ ص ۵۱۴ ، [5] ایضاً ج ۵ ص ۳۱۷ ، [6] ایضاً ج ۴ ص ۶۲۰



اسی طرح سورۂ نور ہی کی تفسیر میں کئی جگہوں پر اور سورۂ فرقان اور سورۂ نمل کی تفسیروں میں اسی طرز کے حوالے ملتے ہیں ،

سورۂ دخان کی تفسیر میں رقمطراز ہیں :

"وهذا الدلیل فی غایة الضعف علی ما بیناه فی اصول الفقه" [1]

سورۂ حدید میں ہے کہ

"سمعت والدی رحمه الله یقول" [2]

ایسے ہی سورۂ حشر میں ہے :-

"... ان المسلم لا یقتل بالذمی وقد بیناه وجهه فی الخلافیات" [3]

ان حوالوں سے صاف پتہ چلتا ہے کہ یہ سب امام رازیؒ کے بیانات ہیں ،

۳ - وہ اسلوب کلام اور انداز بیان جو اس نصف حصہ میں پایا جاتا ہے جس کے متعلق قطعی طور سے یہ ثابت ہے کہ وہ امام فخر الدین رازیؒ کی تفسیر ہے ، وہی انداز اور اسلوب غور وفکر سے پڑھنے والوں کو سورۂ قصص تک نظر آتا ہے ، لیکن اس کے بعد سورۂ عنکبوت کی تفسیر سے سورۂ یٰس تک ایک دوسری روح اور انداز نگارش ہے ، ذیل میں ہم اس کی چند مثالیں نقل کرتے ہیں جس سے دونوں کے فرق وامتیاز کا اندازہ ہوتا ہے ،

الف - قرآن مجید کی بعض سورتوں کے شروع میں حروف مقطعات کا جو استعمال ہوا ہے ، امام رازی نے سورۂ بقرہ کی تفسیر کے شروع میں اس پر بڑی طویل بحث کی ہے ، ان کے نزدیک اس بارہ میں مختار قول یہ ہے کہ یہ حروف سورتوں کے نام ہوتے ہیں ، اور اس قول کا مقتضی آل عمران ، اعراف ، یونس ، ہود ، یوسف ، رعد ، ابراہیم ، حجر ، مریم ، طٰہٰ اور ایسے ہی شعراء ، نمل اور قصص

[1] تفسیر کبیر ج ۵ ص ۵۸۳ ، [2] ایضاً ج ۶ ص ۲۳۲ ، [3] ایضاً ص ۸۷۵

کی تفسیروں کے شروع میں دکھائی دیتا ہے،

لیکن سورہ عنکبوت کی تفسیر کے شروع میں مفسر نے ایک لمبی بحث ایک جدید قول کو ثابت کرنے کے لیے کی ہے، اس بحث کا ماحصل یہ ہے:

"حروف مقطعات مخاطب اور سامع کی تنبیہ کے لیے لائے جاتے ہیں" چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"حکیم اور دانا جب غفلت میں سرشار آدمی سے خطاب کرتا ہے تو اصل گفتگو سے پیشتر ایسی باتیں کرتا ہے جن سے وہ مخاطب کو اپنی طرف مائل کر سکے، اور کبھی اصل گفتگو سے پیشتر کہی جانے والی چیز کوئی بے مفہوم آواز ہوا کرتی ہے، مثلاً کوئی کسی کے پیچھے سیٹی محض التفات کی خاطر بجاتا ہے، اور کبھی یہ آواز منہ سے نہیں دی جاتی ہے، مثلاً کوئی تالی اس لیے پیٹتا ہے تاکہ سننے والا اس کی طرف متوجہ ہو، پس اسی بنا پر ہم یہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگرچہ بیدار مغز تھے مگر چونکہ آپ انسان تھے، اسلیے کبھی کبھی بعض معاملات، بعض امور کیجانب آپ کو ذہول میں مبتلا کر دیتے تھی، اس لیے ایک حکیم و دانا ہستی کے لیے مناسب یہی تھا کہ وہ اصل گفتگو سے پہلے تنبیہ اور ہوشیار کرنے کے لیے حروف لائے، اور پھر یہ حروف جب غیر مفہوم المعنی ہوں تو تنبیہ کے لیے نہایت سود مند ہوتے ہیں۔"

پھر مفسر نے "الم" کے اعراب کے متعلق یہ لکھا ہے کہ

| | |
|---|---|
| قد ذکرنا تمام ذٰلک فی سورۃ البقرۃ | یہ تمام سورہ بقرہ کی تفسیر میں ان وجوں کیساتھ |
| مع الوجوہ المنقولۃ فی تفسیرہ و | جو اس میں منقول ہیں، بیان ہو چکا ہے، |
| نزید ھٰھنا ان علی ما ذکرنا فی | یہاں ہم یہ اضافہ کرتے ہیں جیسا کہ ہم نے بتایا ہے |
| الحروف (من انھا للتنبیہ) لا اعراب لہا | یہ حروف تنبیہ کے لیے ہوتے ہیں اس لیے ان کا |
| (ای الم) لانھا جاریۃ مجری | کوئی اعراب نہیں، کیونکہ یہ ان آوازوں |



| | |
|---|---|
| الاصوات المنبھۃ | کا کام دیتے ہیں جو تنبیہ کے لیے ہوتی ہیں، |

یہ عبارت ہم نے قلمی نسخہ سے نقل کی ہے، اور جو فقرے بریکٹ میں ہیں وہ ہم نے اضافہ کر دیے ہیں، لیکن مطبوعہ نسخہ کی عبارت اس سے مختلف ہے، مگر اس طرز کے حوالوں سے ہمارے مدعا پر کوئی اثر نہیں پڑتا، کیونکہ صاحب تکملہ بھی "قد تقدم" اور "قد ذکر" وغیرہ الفاظ کے ذریعہ اصل کا حوالہ دے سکتا ہے، اور یہ کوئی نامانوس طریقہ نہیں،

اسی طرح سورہ روم کی تفسیر کا افتتاح بھی اسی جدید قول کی بنیاد پر ہوتا ہے، اور اس میں عنکبوت کا حوالہ ملتا ہے، لقمان کے شروع میں وہ خاموشی سے گذر گئے ہیں، سورہ سجدہ میں صرف اتنی بات کے ذکر پر اکتفا کیا ہے کہ

| | |
|---|---|
| قد علم ما فی قولہ الم و قولہ | "الم" اور "لاریب فیہ" کے بارہ میں سورہ |
| لاریب فیہ من سورۃ البقرۃ وغیرھا | بقرہ وغیرہ میں معلوم ہو چکا ہے، |

اور سورہ یٰس کے شروع میں یوں رقمطراز ہیں:

| | |
|---|---|
| قد ذکرنا کلاما کلیا فی حروف التہجی | سورہ عنکبوت میں حروف تہجی کی بابت |
| فی سورۃ العنکبوت | کامل گفتگو ہم بیان کر چکے ہیں، |

(ب) پہلی قسم میں کسی سورہ کا ماقبل کی سورہ سے ربط و نظم واضح کرنے کے لیے کوئی دھیان نہیں دیا گیا ہے لیکن دوسری قسم یعنی عنکبوت، یٰس اور ان کے درمیان کی سورتوں میں اسکا اہتمام ملتا ہے،

(ج) پہلی قسم (بقرہ تا قصص) میں اکثر کلامی مباحث سے تعرض کیا گیا ہے، خواہ یہ بلا ضرورت اور بلا مناسبت ہی کے کیوں نہ ہوں لیکن دوسری قسم (عنکبوت تا یٰس) میں ایسا نہیں ہے،

(س) پہلی قسم میں اکثر مشاہیر اور اکابر معتزلہ جیسے اصم، جبائی، قاضی عبد الجبار، کعبی اور ابو مسلم اصفہانی کے اقوال نقل ہوئے ہیں، اور متعدد مقامات سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صاحب تفسیر کے پاس انکی تفسیریں موجود تھیں لیکن دوسری قسم میں یہ چیز مفقود ہے،

(ح) معتزلہ کے دلائل بھی پہلی قسم میں شرح و بسط کیساتھ اکثر ملتے ہیں اور مصنف نے کہیں انکا جواب دیا ہے، کہیں صرف معارضہ پر اکتفا کیا ہے، کبھی جواب کیطرف محض سرسری اشارہ کردیا ہے، اور کبھی خاموش گذر گئے ہیں، مگر دوسری قسم میں یہ چیز شاذ و نادر ہی ملتی ہے

(ز) پہلی قسم میں مباحثہ اور جدال کے الفاظ مثلاً (سلمنا) (فلم قلتم) وغیرہ کی بہتات ہے، لیکن دوسرے قسم میں اس کا کہیں پتہ نہیں،

(ط) دونوں ہی قسموں میں "کشاف" کے حوالے بکثرت ہیں، مگر پہلی قسم میں "قال صاحب الکشاف" وغیرہ کا اور دوسری میں عموماً "قال الزمخشری" وغیرہ کا التزام ملتا ہے،

(ک) پہلی قسم میں اکثر جب کسی آیت کی تفسیر مکمل ہو جاتی ہے اور دوسری آیت کی تفسیر شروع ہوتی ہے تو "قولہ تعالیٰ" اور دوسری قسم میں "قال تعالیٰ" کا استعمال ملتا ہے۔

(ل) قسم اول میں ہر مدعا و مقصود پر بحث کے لیے اکثر "اعلم" کے لفظ سے آغاز ہوتا ہے، مگر قسم ثانی میں ایسا بہت کم ہے،

(ی) پہلے میں سجع کا قصد و تتبع بہت کم اور دوسرے میں اکثر ہے،

(ق) قسم اول میں صرف مناسب حد تک عربی قواعد سے تعرض کیا گیا ہے، مگر قسم ثانی یعنی میں اس کا زیادہ اہتمام ہے کر بہت غلو سے کام لیا گیا ہے، اور اس سلسلہ میں بڑی وقت آفرینی اور نادر خیالی کا ثبوت دیا گیا ہے، اور ایسی غریب و نادر چیزیں پیش کی گئی ہیں، جن کا عربی کتابوں میں پتہ نہیں چلتا،

(ص) پہلی قسم میں نکات بلاغت سے بس مناسب اعتدال کے ساتھ تعرض کیا گیا ہے لیکن دوسری قسم میں اس سے اکثر تعرض ملتا ہے،

(باقی)



# سعدی دکھنی کا وطن

اور

# ان کے بعض نئے اشعار

از

جناب پروفیسر فرید صاحب ایم اے، لکچرار رابرٹسن کالج برہانپور

سعدی کا شمار دکن کے قدیم ترین شعراء میں ہوتا ہے، اس کے متعلق ہماری معلومات بے حد مختصر اور وہ بھی چند تذکرہ نگاروں کے بیانات تک محدود ہیں، اور ان میں بھی بڑا اختلاف پایا جاتا ہے، یہی حال اس کے اشعار کا ہے، معمولی سے فرق کے ساتھ کچھ اشعار مختلف تذکروں میں ملتے ہیں، سعدی کے وطن کے بارے میں اختلاف رکھنے والے دو گروہوں میں تقسیم ہیں، ایک گروہ سعدی کو دکھنی مانتا ہے، اور دوسرا اکا کوروی بتلاتا ہے،

قیام الدین محمد قائم چاندپوری المولد، رام پوری المدفن، متوفی ۱۲۰۸ھ نے مخزن نکات[1] مرتبہ ۱۱۶۸ھ میں سعدی کو سعدی شیرازی قرار دیا ہے، اور ع بتے دیدم از عاج در سومنات سے ایک نیا افسانہ تراشا ہے

[1] مخزن نکات (ص)۔ دستور الفصاحت میں جناب مولانا امتیاز علی صاحب عرشی نے تحریر کیا ہے کہ قائم نے اپنا تذکرہ بیاض کی صورت میں مرتب کیا تھا، اس کے آغاز کی سب سے پہلی تاریخ ۱۱۵۷ھ ملتی ہے، ۱۱۶۷ھ کے بعد بیاض نے تذکرہ کی شکل اختیار کر لی اور مصنف نے اس کا تاریخی نام۔ مخزن نکات، ۱۱۶۸ھ رکھا، مگر ۱۱۷۶ھ تک اس میں اضافے ہوتے رہے،

مولوی ڈاکٹر عبد الحق صاحب کے قول[۱] کے مطابق میر تقی میر متوفی ۱۲۲۵ھ نے سب سے پہلے نکات الشعرا[۲] مؤلفہ ۱۱۶۵ھ میں اس وطنی انتساب کی تردید کی ہے، اور سعدی کو دکنی قرار دیا ہے[۳]، سید فتح علی خاں گردیزی دہلوی متوفی ۱۲۲۴ھ نے تذکرۂ ریختہ گویان[۴] مرتبہ ۱۱۶۶ھ میں اور میر حسن دہلوی متوفی ۱۲۰۱ھ نے تذکرۂ شعراء[۵] مرتبہ ما بین ۱۱۸۴ھ اور ۱۱۹۱ھ میں سعدی کو دکھنی لکھا ہے، لچھمی نراین شفیق اورنگ آبادی نے چمنستان شعراء[۶] مرتبہ ۱۱۷۵ھ میں سعدی کو دکن کے شعرائے سلف میں شمار کیا ہے، اور اس کو دکن کے روزمرہ سے آشنا اور برہان پوری المدفن لکھا ہے، اور نکات الشعرا سے تین شعر نقل کیے ہیں، دکن میں اردو[۷] کے فاضل مصنف جناب سید نصیر الدین صاحب ہاشمی نے بھی سعدی کو دکنی تسلیم کیا ہے،

اب اُن بزرگوں کے بیانات ملاحظہ کیجیے، جو سعدی کو کاکوروی بتلاتے ہیں،

سید شمس الدین صاحب قادری نے تاریخ زبانِ اُردو[۸] میں نکات الشعرا اور مخزن نکات سے سعدی کے پانچ ابیات نقل کرکے قائم چاند پوری، میر تقی میر اور سید فتح علی گردیزی کے تذکروں سے اقتباسات نقل کیے ہیں، اور ملا نظام الدین کی تصنیف طبقات اکبری[۹] کے حوالہ سے سعدی کو کاکوروی بتلایا ہے، اور بختاور خاں اور ملا عبد القادر بدایونی کے بیانات بھی نقل کیے ہیں، ملا عبد القادر بدایونی نے نام شیخ سعدی ولد شیخ محمد اور تاریخ وفات ۱۰۰۲ھ لکھی ہے، اور یہ لکھا ہے کہ سعدی نے اپنے کسی دوست کو "ہنگام وداع" یہ شعر لکھا تھا

دیدۂ سعدی و دل ہمراہ تست

تا نہ پنداری کہ تنہا می روی[۱۰]

---

[۱] مقدمہ مخزن نکات ص ، [۲] نکات الشعرا ص ۱۰۳ [۳] مقدمہ نکات الشعرا ص ال [۴] تذکرۂ ریختہ گویان ص ۸۲ [۵] تذکرۂ شعرائے اردو ص ۸۰ [۶] چمنستان شعراء ص ۳۵۵ [۷] دکن میں اردو ص ۸۰ [۸] تاریخ زبان اردو ص ۱۲۲، ۱۲۳ [۹] طبقات اکبری ص ۴۵۳ [۱۰] تاریخ اردوے قدیم ص ۱۲۳



جو سعدی شیرازی کا مشہور شعر ہے،

حامد حسن صاحب قادری نے داستانِ تاریخ اردو[۱] میں اور ڈاکٹر نور الحسن صاحب ہاشمی

نے دبستان دہلی[۲] میں کاکوروی لکھا ہے[۳]،

راقم عاجز کے استفسار پر ڈاکٹر صاحب نے لکھا کہ کاکوروی میں ان کو اس نام کے کسی بزرگ

کا پتہ نہیں چلا، اور ان کا خیال ہے کہ شفیق کا بیان صحیح ہوگا،

ذیل میں ہم سعدی دکھنی کے متعلق دو قلمی مخطوطات سے کچھ معلومات پیش کرتے ہیں:-

حضرت شاہ بھکاریؒ متوفی ۹۰۷ھ کے ملفوظ فتح الیقین کے مرتب شاہ حمید الدین نے اس ملفوظ میں ایک روایت نقل کی ہے[۴] کہ برہان پور کے جوار میں چھ میل کے فاصلہ پر موضع شیر پور میں سعدی کا مزار ہے،

شفیق کے اس بیان سے کہ "مرقدش در جوار برہانپور داشت" اس روایت کی تصدیق ہوتی ہے،

حضرت برہان الدین راز الٰہی متوفی ۱۰۸۳ھ کے ملفوظ "روائح الانفاس"[۵] کے مرتب سید عبد الحئی حسینی برہان پوری نے سعدی کو برہان الدین غریب متوفی ۷۳۸ھ مرید محبوب الٰہی حضرت نظام اولیا کا مرید بتلایا ہے[۶]، ایک دوسری روایت میں جامع ملفوظ نے شیر پور (موضع برہان پور) میں سعدی کے مدفن، ان کے عرس اور عرس میں اولیاے برہانپور کی شرکت کا ذکر کیا ہے[۷]،

یہاں یہ عرض کردینا ضروری ہے کہ سعدی نام کے متعدد بزرگ ہوسکتے ہیں، لیکن مشکل یہ ہے کہ ریختہ کے ان اشعار کو جو سعدی کے نام سے مشہور ہیں کس سعدی سے منسوب کیا جائے؟ اس باب میں

---

[۱] داستان تاریخ اردو ص ۸ [۲] دبستان دہلی ص ۵۱ و ۵۶ [۳] کرم نامہ ڈاکٹر صاحب موصوفہ مورخہ ۱۱ رمئی ۱۹۵۸ء [۴] ملفوظ (قلمی) ورق ۱۵ الف [۵] [۶] روائح الانفاس (قلمی) بحوالہ تذکرۂ اولیاے سندھ (مصنفہ حضرت سید مطیع اللہ صاحب راشد برہانپوری) ص ۲۷۷-۲۷۸

راقم کو بعض بزرگوں کی رائے سے اختلاف ہے، میری رائے میں ریختہ کے اشعار اُسی سعدی کی فکر کا نتیجہ ہیں، جس کی ابدی خواب گاہ شیر پور (برہان پور) میں ہے،

مطبوعہ تذکروں میں سعدی کے جو اشعار ملتے ہیں، ان سے کچھ مختلف ابیات ایک مخطوطہ "بیاض شعرائے قدیم" سے نقل کیے جاتے ہیں، بیاض مذکور[1] استاذ محترم سید نجیب اشرف صاحب ندوی کے کتب خانہ میں محفوظ ہے، غالباً یہ اشعار پہلی مرتبہ پیش کیے جارہے ہیں،

جانا ہماری جیو کون، ہمکو بہت پر میت ہے
دل می رود با خود بیبر تن من سو اپنی میت ہے

تج جیو لے کر دک دیا، تیرا ہموں کر کیا کیا
تم وہ کیا، ہم یہ کیا، کیسی بھلی یہ ریت ہے

بندم بعشقِ تو کمر، نت اودھر کروں سینا سپر
کھیلوں جو اپنے سر اوپر، لیکن تمھاری جیت ہے

دو نین رو نہ صد جوئیں، ندیاں بھریں یوں تجھ کوئی
در فرقت تو ہم موئی، کچھ بھی ہماری چیت ہے

سعدی غزل انگیختہ، شیر و شکر آمیختہ
در ریختہ، دُر ریختہ، ہم شعر ہے، ہم گیت ہے

اب ان ابیات کو ملاحظہ فرمایئے، جو تاریخ اردوئے قدیم (مصنفہ حکیم سید شمس الدین صاحب قادری) میں مرقوم ہیں،

تشنہ چو دیدم بر درخت، گفتم کہ یہ کیا ریت ہے
گفتا ورا ے باورے، اس ملک کی یہ ریت ہے

اے مردماں شہر شما، کتنی بری یہ ریت ہے
ہے ہے نمی پرسد، کسے پردیسیا ماریت ہے

ہمنا تمن کو دل دیا، تم دل دیا اور دکھ دیا
ہم یہ کیا، تم وہ کیا، ایسی بھلی یہ پیت ہے

دو نین کی کھپر کہوں، رو رو بخون دل کروں
پیشِ سگِ کوئے دھروں پیا سانجاوے میت ہے

سعدی طرح انگیختہ، شیر و شکر آمیختہ
در ریختہ، دُر ریختہ، ہم شعر ہے ہم گیت ہے

ذیل میں اُن اختلافات کو ملاحظہ کیجئے، جو بیاض میں منقول غزل اور مطبوعہ تذکروں کے اشعار میں پائے جاتے ہیں،

---

[1] اس بیاض کا ذکر نوائے ادب (بمبئی) کی کسی اشاعت میں اوراق پارینہ کے نام سے ہو چکا ہے،



(۱) بیاض کا مطلع اور تیسرا شعر کسی تذکرہ میں نہیں ملتا،

(۲) اردوئے قدیم کا مطلع اور دوسرا شعر بیاض سے بالکل مختلف ہے،

(۳) صاحب تاریخ اردوئے قدیم نے اشعار نکات الشعراء اور مخزن نکات سے نقل کیے ہیں، مگر منقولہ مطلع مذکورۂ بالا تذکروں کے مطبوعہ نسخوں میں ہماری نظر سے نہیں گذرا،[1]

(۴) بیاض کا دوسرا شعر قریب قریب ہر تذکرہ میں ملتا ہے، مصرعۂ اولیٰ

ع تج جیو لے کر دک دیا۔ تیرا ہموں کر کیا کیا

مذکورہ تذکروں میں یوں نقل ہے

ع ہمنا تمن کو دل دیا، تم نے لیا اور دکھ دیا

قادری صاحب نے اس شعر میں نے کے بدلے دل اور اور ریت کے بدلے پیت لکھا ہے،

میر حسن نے تمن کا املا تمھن اور شفیق نے اور کو ہور لکھا ہے، "دک" اور "ہموں" کا املاء بھی ملاحظہ کیجئے، بیاض کے کاتب نے املاء کی "عصری روایتِ تحریر" کو قائم رکھا ہے،

(۵) بیاض کا چوتھا شعر تذکروں میں منقول شعر سے بالکل مختلف ہے،

ملاحظہ کیجئے۔ ایک شعر میں سعدی نے سگِ کوئے حبیب کی خاطر آنکھوں کو پیالہ (کھپر) بنایا، اور اس میں خونِ دل کو آنسوؤں کی شکل میں تبدیل کر کے اس کے سامنے رکھا کر

"پیا سا نہ جاوے میت ہے"

---

[1] ناظرین کرام کی خدمت میں یہاں یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ قادری صاحب نے جن قلمی تذکروں سے یہ اشعار نقل کیے ہوں گے، ان میں یہ مطلع بھی ہوگا، اور اشعار بھی اسی طرح لکھے ہوئے ہوں گے جس طرح سید صاحب موصوف نے نقل کیا ہے، ہماری غرض صرف مطبوعہ تذکروں میں جو اختلاف ہے، اس کو پیش کرنا ہے۔ (فریم)

ہر تذکرہ نگار نے "دو نین کے کھپر کروں" لکھا ہے، شفیق اور میر حسن نے مصرعۂ اولیٰ کے دوسرے جز کو "رو رو انجھوا دل (یا اس میں) بھروں" لکھا ہے، اور خدائے سخن میر تقی میر نے "رو رو بجونِ دل بھروں"

(۶) مقطع میں کوئی فرق نہیں ہے، قائم نے غزل کے بدلے طرح لکھا ہے، اور داستانِ تاریخ اردو میں مصرعۂ اولیٰ کے دوسرے جز نے مصرعِ ثانی کے جزو اول کی جگہ دیکھ اس کی جگہ لے لی ہے۔

مختصر یہ کہ سعدی نے شیر و شکر کی آمیزش سے ریختہ کے صفحات پر جو موتی بکھیرے ہیں، ان کی آب و تاب نمایاں اور قدامت مسلّم ہے، سعدی کے "میٹھے بول" شہد و شکر سے زیادہ شیریں ہیں، ان کو شعر کہیے یا گیت، وہ ریختہ کی "طرح" کو قائم کرتے ہیں جن کے "استادِ شعرائے ہند" فریفتہ تھا،

خوگر نہیں کچھ یوں ہی ہم ریختہ گوئی کے
معشوق جو تھا اپنا باشندہ دکن کا تھا،

---





# آثار علمیہ

## مکتوبات مولانا سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ

بنام

شاہ معین الدین احمد ندوی

۳۹

بھوپال

عزیز مکرم دام توفیقکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ الحمد للہ خیریت ہے، عزیزی اسلم یہاں سے انا و سید حسین کے ہاں جا کر سخت بیمار ہو گئے، بخار اور پیچش میں مبتلا ہیں، اب الحمد للہ تخفیف اور افاقہ ہے، اللہ تعالیٰ صحت عنایت فرمائیں، اس بیچارہ کی صحت بہت خراب ہو گئی ہے،

مولوی مسعود علی صاحب کا مدت سے کوئی خط نہیں آیا، مارچ میں گھر جانے کو لکھا تھا، شاید گھر ہوں، یا کوئی اور بات ہو، خدا کرے بخیر ہوں،

یہاں کے سیاسی و انتظامی حالات موجودہ فضا میں نئی ترتیب و تنظیم کی شکل میں ظاہر ہونے والے ہیں، ابھی تک پردۂ راز میں ہیں، ہفتہ عشرہ میں شاید کوئی صورت بنے، اتنا تو یقینی ہے کہ نواب صاحب نے مالوہ میں شمولیت سے انکار کر دیا ہے،

امید ہے کہ آپ کے شہر میں اب سکون ہو، اور خصوصیت سے دار المصنفین میں،

آپ اپنے لیے تاریخ کے سوا کوئی دوسرا میدان ڈھونڈھیے، اتنے دنوں میں آپ کا مذاق پختہ ہوچکا ہے، آپ ہی بتائیں کہ ادب، فلسفہ، کلام کون سا میدان پسند ہے، یا عصریات میں سے کوئی چیز مرغوب خاطر ہو،

میں نے پوچھا تھا کہ اسوقت معارف کے خریدار کتنے ہیں؟ جواب نہیں آیا، آپ مطلع کریں کہ معارف کتنا چھپتا ہے، اور اس کی کتنی اشاعت ہے، اور کتنی خریداری ہے، یہ بھی معلوم نہیں کہ مطبع میں کیا کتابیں زیر طبع ہیں، رحمت عالم کے متعلق اسلامی ساہتیہ رام نگر بنارس کے پتہ سے قمر الدین صاحب کو لکھ دیا جائے کہ تبادلہ سے معذوری ہے، البتہ رحمتِ عالم کے نسخے بچاس فیصدی کمیشن پر ان کو دیدیں گے، یحییٰ صاحب سے کہدیجئے،

ایک مختصر مضمون جاتا ہے، رسید سے مطلع کریں،

صباح الدین صاحب اور بشیر و نیاز صاحب و حکیم صاحب. و ڈاکٹر صاحب سے سلام کہدیں، شعبۂ تعلیمات بہار نے ایک کمیشن میں مجھے مقرر کیا ہے، اگر آنا ہوا تو شاید ملاقات ہوسکے،

والسلام

سید سلیمان، ۲۴؍ مارچ ۱۹۴۸ء

۴۰

دیسنہ

عزیز مکرم السلام علیکم ورحمۃ اللہ

کارڈ ملا، میرا دل تو چاہتا ہے کہ آپ لوگوں سے مل کر جاؤں لیکن متعلقین کا ساتھ ہوگا، اس لیے دقت محسوس کرتا ہوں، تاہم مایوس نہیں ہوں،

اخبارات میں اپیل کی اشاعت اور تائیدی نوٹ مفید ہیں، مگر عملی نتیجہ ذاتی کوشش ہی سے ہوسکتا ہے، آپ کو خود عملی قدم اٹھانا چاہیے، اس سے لوگوں سے تعلقات پیدا ہوں گے،



جو دار المصنفین کے لیے مفید ہوگا،

نجیب اشرف صاحب نے بمبئی سے بذریعہ بیمہ رجسٹری ایک قلمی کتاب اکبر نامہ مصور دار المصنفین میں بھیجی ہے، وہ پہنچی یا نہیں مطلع کیجئے، اگر پہنچی ہو تو اس کو داخل کتب خانہ کیجئے، اور اس کی قیمت ایک سو روپیہ میرے حساب میں جمع کر دیجئے، میں نے مالک کو اپنی طرف سے قیمت ایک سو روپیہ ادا کردی ہے،

میاں صباح الدین صاحب کا نکاح عزیزوں ہی میں دو چار روز میں ہونے والا ہے، اور عجب نہیں کہ ڈوم قافلہ اس دفعہ اعظم گڈھ پہنچیں،

میرا قیام یہاں ۱۵؍ جون تک ہے، دو چار روز پٹنہ رہ کر اناؤ کا قصد ہے، اور وہاں سے بھوپال ۲۵؍ جون تک، آم یہاں بھی کم ہیں، اور گراں بھی ہیں، والسلام

سید سلیمان، ۹؍ جون ۱۹۴۹ء

(۴۱)

بھوپال

برادرم سلمہ اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ، یحییٰ صاحب کا مرسلہ بیمہ مل گیا، ان سے کہدیجئے، یہ سنکر خوشی ہوئی کہ حیدر آباد کی رقم وصول ہوگئی،

اس وقت تو سفر حج درپیش ہے، اور دعا کرتا ہوں کہ موانع مرتفع ہوں اور وصال محرومی نہ رہے، اس سلسلہ میں جی چاہتا ہے کہ اپنے سارے رفقا سے جن کے ساتھ زندگی کا بڑا اور اہم حصہ بسر ہوا، اپنی تقصیرات کی معافی چاہوں، اور یہ رسمی طور پر نہیں، بلکہ واقعی طور پر، اس لیے آپ اور دیگر رفقا سے آپکے ذریعہ یہ خواہش پیش ہے، میں اپنے دل سے بھی سب کو معاف کرتا ہوں،

دار المصنفین کے مستقبل کے متعلق آپ کو جو تشویش آج ہے وہ میرے سامنے اول روز سے ہے، اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ آپ کو اور آپ کے ساتھ کام کرنے والوں کو ہمت اور استقلال بخشے، آپ اس قدر گھبراتے کیوں ہیں، دوامی زندگی لے کر تو کوئی آیا نہیں، ع آج وہ کل ہماری باری ہے، پھر کام تو آپ ہی لوگوں کو کرنا ہے،

میں سفر حج کے سوا کوئی اور پہلو اس وقت سامنے رکھنا نہیں چاہتا، انشاء اللہ تعالیٰ اس سے فراغت پاکر اور چیزیں سامنے آئیں گی،

مولوی عبد السلام صاحب سے بھی بعد سلام یہی درخواست ہے، اگر وہ کرم کریں تو زہے لطف

عزیزی صباح الدین کو دعا، دیگر کارکنوں کی خدمت میں بھی یہی درخواست ہے،

والسلام - سید سلیمان، ۱۱/ اگست ۱۹۴۹ء

(۴۲)

برادر عزیز دام توفیقکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ الحمد للہ خیریت ہے، میں یہاں سفر ہی سفر میں رہا، چند روز میرٹھ رہا، پھر سید حسین کے ساتھ میرٹھ سے غازی آباد گیا، غازی آباد دو روز رہ کر علی گڈھ گیا، وہاں دو دن رہ کر پھر غازی آباد واپس آیا، غازی آباد سے قافلہ پھر میرٹھ آگیا، خدا کا شکر ہے کہ نزلہ اور حلق کی کھانسی کے سوا جو اب روبہ تنزل ہے، میں بالکل اچھا ہوں، رشید صاحب کے اصرار سے ڈاکٹر اسلام الحق نے میرا قارورہ جانچا اور قلب اور خون کا دباؤ وغیرہ دیکھا، اور سب کو درست پایا،

شذرات کو میں خود سوچ رہا تھا، مگر ابھی تک طبیعت یکسو نہیں ہوئی ہے، انشاء اللہ دو چار روز میں بھیجوں گا، آپ وطن جانا چاہتے ہیں تو بشوق جائیں، عرب کی حکومت کے منافع کے متعلق ادریس صاحب کو رقعہ لکھ کر اس میں رکھ رہا ہوں،



اعظم گڈھ کی سرگرمیوں کا حال معلوم ہوتا رہا، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ دار المصنفین میں سکون کی فضا قائم رکھے،

پروفیسر عبد الغنی صاحب کی کتاب کو رہنے دیجئے، ان جھگڑوں میں پڑنے کا وقت نہیں،

والسلام - سید سلیمان، ۲۶/ نومبر ۱۹۴۹ء

(۴۳)

بھوپال

برادرم السلام علیکم ورحمۃ اللہ

میں ۲۵ کو یہاں مقدمہ کے سلسلہ میں آیا تھا، مقدمہ تو بخیر وخوبی اس طرح ختم ہو گیا کہ کسٹوڈین صاحب نے بڑی تعظیم وتکریم سے اجلاس میں بٹھایا، اور فرمایا کہ آپ نے کیوں تکلیف فرمائی، گورنمنٹ نے آپ پر سے مقدمہ اٹھا لیا اور چلتے وقت بھی کھڑے ہو کر تعظیم دی اور ہاتھ ملا کر رخصت کیا، سبب اس کا سوائے فضل الٰہی اور کیا کہا جائے،

یہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ یکم جون سے حکومت نے دار القضا، دار الافتا اور مجلس العلما کے محکمے توڑ دیے، چنانچہ میری رخصت بہت مفید ثابت ہوئی کہ یہاں کے جھگڑوں سے بچ گیا، اب مسلمان پبلک چاہتی ہے کہ جمہور مسلمین کی طرف سے ان محکموں کو قائم رکھے، مشورے ہو رہے ہیں، کمیٹیاں بنائی گئی ہیں،

میں یہاں سے آج جا رہا ہوں، چند روز کانپور رہ کر اعظم گڈھ اور وطن کا قصد ہے، اللہ تعالیٰ پورا فرمائیں، میرے خطوط وہیں روک لیں،

مولوی مسعود علی صاحب واپس آگئے ہوں تو سلام کہہ دیں اور حال بتا دیں،

والسلام

سید سلیمان، ۲/ جون سنہ ۱۹۵۰ء

(۴۴)

کراچی

برادرِ عزیز حفظکم اللہ تعالیٰ وسلم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ، آپ کا کارڈ عین حالتِ انتظار میں ملا، آپ کا وہ لفافہ جس میں ڈابل کے اقتباسات تھے، مل گیا تھا، ان ہی سے یہاں کی ہسٹاریکل کانفرنس میں ڈابل پر ایک مضمون لکھکر پڑھا،

یہاں تو گرمی ایسی نہیں، دن بھر اور رات بھر بحری ہوا چلتی رہتی ہے، البتہ کبھی کبھی ہوا میں گرمی آجاتی ہے، یعنی وہاں کی اصطلاح کے مطابق یہاں اکثر پروا اور گاہے گاہے پچھوا ہوا چلتی ہے، اس ہوا میں پانی یہاں بھی ٹھنڈا ہوجاتا ہے، رمضان کی آج دوسری اور مئی کی ستائیس ہے، سنیچر سے روزہ ہے، تراویح گھر ہی پر ہوتی ہے، ایک بھوپال کے حافظ پڑھاتے ہیں، تین صفیں ہوتی ہیں،

اس مہینہ کے معارف کی چھپائی بہت ناقص ہے، حروف اڑے ہوئے ہیں، سبز واری صاحب اور نواب اثر صاحب کے مضامین میں رکاکت تک معاملہ پہنچا معلوم ہوتا ہے، رسالہ کے مضامین میں تنوع کا خیال ضروری ہے،

میرا عراق جانا نہ ہوا کچھ تو لاہور میں دیر ہوگئی، اور کچھ حکومت کی طرف سے منظوری میں دیر ہوئی، ادھر چند ماہ سے تنفس کی تکلیف رات کو ہوجاتی ہے، کوئی معدہ کے سبب سے بتاتا ہے، کوئی سستی گردش خون کے باعث، علاج جاری ہے،

آم یہاں ہر قسم کے ملتے ہیں، صرف روپے چاہئیں، پان بھی یہاں مہنگے ہیں، لوگوں کا اندازہ ہے کہ کئی لاکھ روپے کے پان یہاں ہر روز ہندوستان سے آتے ہیں، اور وہ بھی تول کر بکتے ہیں،

والسلام

سید سلیمان، ۲۷ مئی ۱۹۵۲ء



# ادبیات

## غزل

از جناب اشفاق علیخاں صاحب نقشا ایم اے، ایل، ایل، بی شاہجہانپور

اسی کے ہاتھ اورنگِ جہانِ صبح و شام آیا / جو میدانِ عمل میں بن کے تیغِ بے نیام آیا

اٹھائے بے خطر جس نے قدم پہنچا وہ منزل تک / جو اُٹھا دل کی دھڑکن لیکے، بے نیلِ مرام آیا

سمٹ کر ہوگئے خانہ نشین تدبیر کے سائے / مری تقدیر کا خورشید جب بالائے بام آیا

حریفِ فتنۂ اہلِ چمن دانش نہ تھی جس کی / وہ طائر زیرِ دام آنا تھا، آخر زیرِ دام آیا

سنا ہے شور تھا کل نعرۂ تحسیں کا محفل میں / کتابِ فاتحانِ دہر میں جب میرا نام آیا

ذرا سی عجلتِ ناوقت کی لغزش ہوئی مجھ سے / ادھر محفل سے میں اٹھا، اُدھر گردش میں جام آیا

عبث جلتا ہے جی اس طائرِ نورستہ کے غم پر / جو اپنی سادگی سے پھر چمن میں زیرِ دام آیا

نہ دیکھا مشکلاتِ زندگی کا چارہ گر کوئی / فقط اک جذبۂ مشکل پسندی میرے کام آیا

کہوں کیا زور تجھ سے پاسِ ناموسِ تمنا کا / کہ میرے پاس خود چل کر مری قسمت کا جام آیا

مجھے اس آیۂ رحمت کا اعجازِ کرم سمجھو / خود آیاتِ خداوندی میں جسکا احترام آیا

## غزل

از جناب چندر پرکاش جوہر بجنوری

کیا جانے ربط کیا تھا ترے سنگِ در کے ساتھ
سجدے میں کائنات جھکی میرے سر کے ساتھ

اٹھی جدھر نگاہ تلاشِ اثر کے ساتھ
جلوے سمٹ کے آگئے، ذوقِ نظر کے ساتھ

وہ ذرے خاکِ دل کے ہیں کس درجہ خوش نصیب
وابستہ ہوگئے جو تری رہ گذر کے ساتھ

کچھ ایسے حادثے بھی ہیں آغازِ عشق کے
اک ربط خاص ہے جنھیں تیری نظر کے ساتھ

اے دل فریبِ شوق میں اتنا نہ محو ہو
اپنی خبر بھی چاہیے ان کی خبر کے ساتھ

امدادِ غیر اور سفرِ منزلِ حبیب
ہے ننگ جستجو جو رہوں راہبر کے ساتھ

کچھ تلخیِ حیات ہی پہ یہ منحصر نہیں
ہر غم مجھے قبول غمِ معتبر کے ساتھ

منزل کی فکر کیا تجھے اے محوِ جستجو
منزل تو ہر قدم پہ ہے عزمِ سفر کے ساتھ

جوہر مری نگاہ میں تازہ ہے آج بھی
وہ "حادثہ" ہوا تھا جو پہلی نظر کے ساتھ

## غزل

از جناب برکت علی صاحب منہاس

مآلِ زیست فنا ہے نہ میں نہ تو باقی
بساطِ دہر پہ اک نقشِ وحدہٗ باقی

بیانِ شوق میں گو ہوگئی زباں صد چاک
مجھے ابھی ہے تمنائے گفتگو باقی

ہوا ہے سبزۂ بیگانہ زینتِ بستاں
رہی چمن میں نہ کچھ گل کی آبرو باقی

ہوئے ترا دشِ مژگاں سے دیدۂ گذر سیرآب
ہمارے دل میں نہیں قطرۂ بھر لہو باقی

خمارِ بادۂ دوشینہ کا فشار تو ہے
نہیں جو شیشہ و پیمانہ و سبو باقی

ہوا ہے خون زبس دل میں ہر تمنا کا
اب آرزو کی نہیں دل میں آرزو باقی



# مطبوعاتِ جدیدہ

**مسند امام اعظم مترجم** - مترجمہ مولانا سعد حسن صاحب مناؒ، تقطیع بڑی، ضخامت ۴۳۹ صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد ۸، پتہ: محمد سعید اینڈ سنز تاجران کتب قرآن محل، مقابل مولوی مسافر خانہ، کراچی

حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی مرویات کی مسندیں بہت سے محدثین نے مرتب کیں، ان میں بعض چھپ بھی گئی ہیں، ان مسندوں میں حافظ ابو محمد عبد اللہ بن محمد بن یعقوب حارثی کی مرتب کردہ مسند زیادہ مشہور ہے، علامہ حصکفی نے اس کا اختصار اور ملا عابد سندھی نے اس کی تبویب کی تھی، آجکل یہی اختصار عام طور سے مسند امام اعظم کہلاتا ہے، اردو میں سب سے پہلے مولانا احمد علی محدث سہارنپوری نے اس کا ترجمہ کیا تھا، جواب ملتا بھی نہیں، اس لیے مولانا حیدر حسن صاحب محدث ٹونکی مرحوم کے خلف الصدق مولانا سعد حسن صاحب نے دوبارہ اس کا ترجمہ کیا ہے، اور فوائد کے عنوان سے ہر حدیث کی ضروری تشریح، اس سے متفرع احکام و مسائل اور دوسرے مفید معلومات بھی تحریر کر دیے ہیں، جس سے اس ترجمہ کی حیثیت شرح کی ہوگئی ہے، ترجمہ صاف اور سلیس اور فوائد نہایت مفید اور حدیث پر مترجم و شارح کی وسعتِ نظر کے شاہد ہیں، کتاب کے شروع میں مولانا عبد الرشید صاحب نعمانی کے قلم سے مسانید امام اعظم اور ان کے مرتبین کا مختصر حال، مسند حارثی کا تعارف اور مولانا قاری احمد پیلی بھیتی کے قلم سے حضرت امام اعظم کے مختصر حالات ہیں،

**خلفائے راشدین اور اہل بیت کرام کے باہمی تعلقات** مترجمہ مولانا محمد احتشام الحسن صاحب کاندھلوی، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۱۴۶ صفحات، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، قیمت مجلد عہ۱۲ر۔ پتہ: مکتبہ برہان اردو بازار، جامع مسجد، دہلی،

خلفاء راشدین اور صحابۂ کرام کے تعلقات، اہل بیت عظام سے بڑے خوشگوار تھے، وہ علانیہ ایک دوسرے کے فضائل وکمالات کا اعتراف کرتے، اور باہم معاون ومددگار رہتے، اگر ان میں کبھی کوئی اختلاف ہوتا بھی تھا تو اس کی حیثیت اس اختلاف سے زیادہ نہ تھی جو آپس میں ہو جایا کرتا ہے، مگر اس کا اثر ان کے تعلقات پر نہ پڑتا تھا، مگر شیعی روایات میں ان کے اختلاف کی جو بدنما شکل نظر آتی ہے، وہ صحابہ اور اہل بیت کرام کیا معمولی انسانوں کے درجہ سے بھی فروتر ہے، علامہ جار اللہ زمخشری نے "الموافقۃ بین اہل البیت والصحابۃ" کے نام سے ان بزرگوں کے تعلقات پر ایک کتاب لکھی تھی، جس میں حدیث وتاریخ کی کتابوں سے ان تمام واقعات وحالات کو جمع کر دیا ہے، جن سے صحابۂ کرام، اہل بیت نبوی اور خلفاے راشدینؓ کے اتحاد و اتفاق اور ان کے باہمی اخلاص و یگانگت کا ثبوت ملتا ہے، ان واقعات سے اس ثبوت کے علاوہ اس مقدس دور کی اور بہت سی خصوصیات سامنے آجاتی ہیں، مگر اس میں معتبر اور مستند روایات کے ساتھ غیر مستند بلکہ بعض لغو روایات بھی شامل کر لی گئی ہیں، مگر اس سے کتاب کی خوبی پر اثر نہیں پڑتا، ترجمہ صاف اور سلیس ہے،

**جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات**۔ از جناب اسرار احمد صاحب آزاد، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۴۰۸ صفحات، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، قیمت مجلد عہ۔ پتہ: مکتبہ برہان، جامع مسجد، دہلی،

آج کل بین الاقوامی معاملات اور سیاسی امور ومسائل میں بکثرت ایسی اصطلاحیں



آتی ہیں، جن کو بہت سے انگریزی داں بھی نہیں سمجھتے، لائق مصنف نے اس کتاب میں افراد، اقوام، ملکوں، قوموں، اداروں، تحریکوں، نظریوں، معاہدوں، اصطلاحوں، اعلانات، مسائل، تنازعات، اجتماعات، واقعات اور تجاویز وغیرہ سے متعلق ان تمام اصطلاحوں کو جمع کر کے ان کی تشریح کی ہے، جن کا تذکرہ اخبارات میں آتا ہے، اس لیے یہ کتاب نہ صرف اردو خواں بلکہ انگریزی داں طبقہ کے لیے بھی مفید ہے،

**نسوان ہند**۔ مولفہ جناب فصیح الدین صاحب بلخی، تقطیع چھوٹی، ضخامت تقریباً ۳۰۰ صفحات، کاغذ، کتابت وطباعت معمولی، قیمت مجلد للعہ۔ پتہ (۱) اقبال بک ڈپو پٹنہ نمبر ۶ (۲) محمد شمس الدین تاجر کتب مالک شمسی پریس پٹنہ سٹی،

ہندوستان کی تاریخ میں بہت سی ایسی خواتین پیدا ہوئیں جنھوں نے مختلف کمالات میں نام پیدا کیا، مگر ان کے حالات اردو میں بہت کم ملتے ہیں، شاعر خواتین کے حالات تو تذکروں میں مل جاتے ہیں، بلکہ ان کے مستقل تذکرے بھی موجود ہیں، لیکن کوئی ایسی کتاب نہیں ہے جس میں ہر صنف اور ہر فن کی صاحب کمال خواتین کا ذکر ہو، اسی مقصد کے لیے یہ کتاب لکھی گئی ہے، یہ کئی حصوں پر مشتمل ہے، پہلے حصہ میں شاعر خواتین کا حال ہے، دوسرے میں مصنف اور صاحب قلم خواتین کا، تیسرے میں جنھوں نے کسی خاص فن میں کمال پیدا کیا، چوتھے میں جنھوں نے کوئی سیاسی تمدنی یا اخلاقی کارنامہ انجام دیا ہے، پانچویں میں عابدہ وزاہدہ خواتین کا ذکر ہے، کتاب اگرچہ سرسری ہے لیکن مفید ہے،

**سلسلۂ تعلیم عربی چار حصے** مرتبہ جناب مولانا محفوظ الرحمٰن صاحب نامی، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، چاروں حصوں کی قیمت عہ۱۲ر۔ پتہ: منیجر مکتبہ ترجمہ قرآن، بہرائچ یو، پی

مولانا محفوظ الرحمٰن نامی، عربی زبان اور قرآن مجید کی تعلیم کی جو مفید خدمت انجام دے رہے ہیں، اس سے دینی حلقہ پوری طرح واقف ہے، پہلے انھوں نے تعلیم القرآن کے رسالوں کا پورا سلسلہ مرتب کیا تھا، جو بہت مقبول ہوا، اب انھوں نے اردو اور عربی کی تعلیم کے رسالوں کا سلسلہ ترتیب دیا ہے، اس کے چار حصے ہیں، اس کی تالیف میں اس کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ عربی اور اردو کی تعلیم کے ساتھ اسلام کے ضروری عقائد عبادات، معاملات، اخلاق اور عام معلومات سے بھی واقفیت ہو جاتی ہے، یہ سلسلہ بہت مفید اور اس لائق ہے کہ اسلامی مکاتب و مدارس میں پڑھانے کے علاوہ اس کی تعلیم کے مخصوص حلقے قائم کیے جائیں، فاضل مرتب ان دونوں سلسلوں کو پورے ہندوستان میں پھیلانے کی کوشش کر رہے تھے کہ چند مہینوں سے فالج میں مبتلا ہو گئے، گو اب پہلے کے مقابلہ میں ان کو افاقہ ہے، مگر ابھی عرصہ تک وہ دوڑ دھوپ کرنے کے قابل نہ ہو سکیں گے، اس لیے مسلمانوں کا یہ فرض ہے کہ وہ مولانا موصوف کی کامل صحت کے لیے دعا کریں اور ان کے اس دینی اور تعلیمی کام کو پورا کرنے کی کوشش کریں،

**گلبانگ حرم**۔ از جناب زائرِ حرم حمید صدیقی صاحب، تقطیع اوسط، ضخامت ۲۰۰ صفحات، کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد ے، پتہ: (۱) حاجی غنی احمد صاحب تاجر کتب چوک لکھنؤ (۲) منیجر مطبع رزاقی پٹکا پور، کانپور،

زائرِ حرم جناب حمید صدیقی کی نعتوں کی شہرت تعارف سے مستغنی ہے، ان کی مقبولیت کا یہ ثبوت ہے کہ چند برسوں کے اندر ان کی نعتوں کے مجموعہ گلبانگ حرم کے کئی اڈیشن نکل چکے ہیں، اب اس کا چوتھا اڈیشن شائع ہوا ہے، جس میں نئی نعتیں بھی شامل ہیں، تمام اصنافِ سخن میں نعت گوئی بہت مشکل ہے، اس کے لیے اخلاص و محبت کے جذبہ کے ساتھ جس اعتدال، توازن اور حد و شناسی کی ضرورت ہے، وہ کم شعرا میں پائی جاتی ہے، اس لیے اردو میں



اچھے نعت گو بھی بہت کم ہیں، اس زمانہ میں اچھے نعت گو صرف دو کہے جا سکتے ہیں، ایک اقبال سہیل مرحوم، دوسرے حمید صدیقی صاحب، حمید صاحب کی نعتیں ظاہری اور معنوی محاسن سے آراستہ اور نعت کا صحیح نمونہ ہیں، ان میں کوثر و تسنیم کی طہارت و پاکیزگی، اور شراب طہور کا کیف و سرور ہے، مگر جذب و مستی میں بھی ان کا قدم جادۂ مستقیم سے نہیں ہٹتا، زبان و بیان کی سلاست و روانی میں سہل ممتنع کی حیثیت رکھتی ہیں، وہ غزل گو بھی ہیں اور ان کا تغزل بھی بڑا ستھرا و پاکیزہ ہے، لیکن اب انھوں نے اس فرسودہ داستان کو چھوڑ کر اپنی شاعری کو ممدوح و محبوبِ دو عالم کی مدح و ثنا کے لیے وقف کر دیا ہے، اور ان کی یہ عقیدت بارگاہ رسالت میں اتنی مقبول ہوئی کہ زائرِ حرم ان کا لقب ہو گیا، اور حمید صدیقی اور نعت ایسے لازم و ملزوم بن گئے ہیں کہ ایک کے تصور سے دوسرے کا تصور جدا نہیں ہو سکتا، اربابِ ذوق بھی کوثر و تسنیم کے ان لطیف جرعوں سے لطف اندوز ہوں،

**سدرہ و طوبیٰ**۔ جناب الم مظفر نگری، تقطیع اوسط، ضخامت ۱۹۸ صفحات، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد عہ، پتہ: مکتبہ برہان، اردو بازار، جامع مسجد دہلی،

جناب الم مظفر نگری مشہور اور کہنہ مشق شاعر ہیں، ان کی علمی استعداد پختہ اور فن شاعری پر ان کی پوری نظر ہے، اس لیے کلام بھی استادانہ ہے، اس کے دو مجموعے پہلے شائع ہو چکے ہیں، یہ تیسرا مجموعہ ہے، اس کا ایک حصہ نظموں اور دوسرا غزلوں پر مشتمل ہے، بیشتر نظمیں اخلاقی و حکیمانہ خیالات اور ملی جذبات سے معمور اور اخلاقی درس کی حیثیت رکھتی ہیں، اور واقعی سدرہ و طوبیٰ کہلانے کی مستحق ہیں، غزلوں کا رنگ بھی بلند، ستھرا اور پاکیزہ ہے، اس لیے یہ مجموعہ ظاہری اور معنوی دونوں حیثیتوں سے اصحابِ ذوق کے مطالعہ کے لائق ہے،

**نہرو**۔ مترجمہ محمد بدران، تقطیع اوسط، ضخامت ۲۰۰ صفحات، کاغذ معمولی،

خوبصورت ٹائپ میں چھپی ہے، المکتبۃ الانجلو مصریہ نمبرہ ۱۶۵ شارع محمد بک قاہرہ سے ملیگی،

پنڈت جواہر لال نہرو کی خود نوشت سوانح عمری تعارف سے مستغنی ہے، یہ کتاب اتنی مقبول ہوئی کہ مختلف زبانوں میں اس کا ترجمہ ہوچکا ہے، اب مصر کے ایک اہل قلم محمد بدران نے عربی میں اس کا ملخص ترجمہ کیا ہے، پنڈت جی کی پوری زندگی جنگ آزادی میں گذری، اس لیے یہ کتاب ان کی سوانح کے ساتھ ۱۹۳۶ء تک کی جنگِ آزادی کی سرگذشت بھی ہے،

**اسلامی عبادات اور اخلاقی تعلیمات** } از مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی، تقطیع اوسط، ضخامت ۹۶ صفحات، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت عہ، پتہ: دفتر آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، علی گڈھ،

یہ رسالہ بچوں کی ابتدائی تعلیم کے لیے لکھا گیا ہے، اس میں اسلامی عبادات نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کے ضروری مسائل اور اسلام کی موٹی موٹی اخلاقی تعلیمات کو سلیس اور دلنشین انداز میں تحریر کیا گیا ہے، کتاب اگرچہ بچوں کے لیے لکھی گئی ہے، مگر اس سے بڑی عمر کے لوگ بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں،

**سیرت پاک** ۔ از جناب بشیر محمد صاحب شارق دہلوی، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۹۲ صفحات، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، قیمت مجلد ۸/ عہ، پتہ: نور محمد کارخانہ تجارت کتب، آرام باغ بالمقابل مولوی مسافر خانہ، کراچی۔

یہ سیرت نبوی بھی بچوں کے لیے لکھی گئی ہے، اس میں سیرت پاک کے واقعات کو آسان اور سلیس زبان میں قلمبند کیا گیا ہے، آخر میں خلق نبوی کے کچھ سبق آموز واقعات لکھے گئے ہیں، اور چالیس اخلاقی حدیثیں مع ترجمہ تحریر کی گئی ہیں، کتاب بچوں کے لیے مفید ہو،

"م"

جلد ۸۰ ماہ صفر المظفر ۱۳۷۷ھ مطابق ستمبر ۱۹۵۷ء عدد ۳

مضامین